مُصنّفہ

پروفیسر ہاورڈ آر۔ پینی مین

(جارج ٹاؤن یونیورسٹی، امریکہ)

مترجمہ

ڈاکٹر احمد عبدالقدیر، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

شعبۂ بین الاقوامی تعلقات، کراچی یونیورسٹی

و

وقار احمد بی۔ اے آنرز (لندن)

شعبۂ تاریخ، کراچی یونیورسٹی

ادارت

سید ابوالخیر کشفی

شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی

اردو اکیڈمی سندھ، کراچی - حیدرآباد - لاہور

The American Political Process.
by Howard R. Penniman

تعداد اشاعت : پانچ ہزار
تاریخ اشاعت : اکتوبر ۱۹۶۴ء
مطبوعہ : باب الاسلام پریس، کراچی

قیمت
ایک روپیہ پچاس پیسے

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی پچاس ریاستوں میں سے ہر ریاست اپنے انتخابی انتظامات کی خود ہی ذمہ دار ہوتی ہے۔ سیاسی جماعتوں کی تنظیم بھی قومی سطح پر [illegible] جاتے ہیں۔

البتہ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ملک بھر میں جماعتوں اور انتخابی انتظامات میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو امریکی سیاسیات اور انتخابات کو بیان کرنے کے لئے کئی جلدیں بھی ناکافی ہوتیں۔

اس چھوٹی سی کتاب میں متعدد ریاستوں کے انتخابی نظام کو تفصیل سے بیان کرنے کی گنجائش تو نہیں ہے تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ پورے نظام کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے اور ایک مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔ البتہ جہاں کہیں انتخابات کے طریقہ کار یا اس سے متعلقہ قانون میں فرق پایا جاتا ہے وہاں اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اسی طرح پارٹیوں کی تنظیم اور طریق کار کا فرق بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ بہرحال انتخابات اور ریاستی پارٹیوں کے طریقہ کار کے معاملے میں بھی صرف ایسے اختلافی پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جو ایک سے زائد ریاستوں میں پائے جاتے ہیں۔

اس کتاب کے بعض موضوعات پر کچھ ایسے سیاسی مفکروں سے تبادلہ خیال کیا گیا جنہیں امریکی سیاست اور رائے عامہ سے گہری دلچسپی ہے،

اس گفتگو سے کتاب کے کئی حصوں میں بعض مخصوص نکات کو وضاحت کے
ساتھ پیش کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ میں خاص طور پر فرینکلن ۔ ایل ۔
برڈسٹ کا ممنون ہوں جنہوں نے یہ بات بتائی کہ ملک کی پچاس ریاستوں
میں پارٹی کی تنظیمیں ایک دوسرے سے قدرے مختلف ضرور ہیں لیکن امریکہ
کی بڑی سیاسی پارٹیوں کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ ان کا دامن
بڑا کشادہ ہے، دنیا کے کسی اور جمہوری نظام میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ انفرادیت بڑی حد تک براہ راست ابتدائی
انتخابات کی بدولت حاصل ہوئی ہے تاہم جن ریاستوں میں نامزدگی کے
امیدواروں کا انتخاب پارٹی لیڈروں کے ہاتھ میں رہتا ہے وہاں بھی
معاشرے کے ہر طبقے سے امیدواروں، جماعتوں اور لیڈروں کا انتخاب
کیا جاتا ہے اور یہ روش ایک روایت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ معاشرے
کے ہر طبقے کا وہ فرد جس میں حوصلہ اور صلاحیت ہو، امریکی پارٹیوں میں بڑا مرتبہ
حاصل کر سکتا ہے اور اس کی نسلی اور اقتصادی حیثیت ترقی کی راہ میں حائل
نہیں ہو سکتی۔ امریکی سیاست میں آزادانہ حصہ لینے کی یہ آزادی کچھ تو روایات
اور قوانین کی بدولت ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ مختلف طبقوں پر مشتمل
یہ معاشرہ مساوات پسند واقع ہوا ہے۔ سیاسی طریقہ کار کی مختلف شکلیں
نظام سیاست کی اسی وسعت اور کشادگی کا نتیجہ ہیں، اس کتاب کے کئی حصوں
میں ان کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے امریکہ کے انتخابی طریقہ کار
کے پورے نظام کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

واشنگٹن ۔ ڈی سی،
یکم ستمبر ۱۹۶۲ء

ہاورڈ ۔ آر پینی مین

۱

تعارف

زیادہ عرصہ نہیں گزرا یعنی یہی کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے جب کسی کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو دوست احباب تو مولود کے والدین سے گفتگو کے دوران اکثر کہہ دیتے کہ یہ بچہ شاید بڑا ہو کر امریکہ کا صدر بن جائے گا۔ والدین بھی اگرچہ اس امکان سے انکار نہ کرتے تاہم وہ ضرور کہتے کہ ہمارے خیال میں اس بچے کے کاشتکار ڈاکٹر یا وکیل بننے کے زیادہ امکانات ہیں۔

اس قسم کی گفتگو اگرچہ مزاحیہ انداز میں ہوتی لیکن والدین اور دوست احباب جانتے تھے کہ امریکی طرز زندگی میں ایسی کوئی رکاوٹ رنگ و نسل کی بنیاد پر نہیں ہے جو کسی بچے کو ملک و قوم کے اعلیٰ ترین منصب پر پہنچنے میں سد راہ ہو۔ یہ گفتگو دراصل امریکی سیاست کی روایتی اصطلاح "جھونپڑے سے وہائٹ ہاؤس" کا سیدھا سادہ اظہار ہوتی تھی، حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۲۸ میں اینڈریو جیکسن کے انتخاب کے سو سال بعد تک ہر صدارتی امیدوار جس کے لیے یہ کہنا ممکن ہوتا اس بات کے اظہار میں خاص فخر محسوس کرتا تھا کہ وہ ایک جھونپڑے میں پیدا ہوا اس کی پرورش غریب گھرانے میں ہوئی لیکن ابتدائی زندگی کی مشکلات کے باوجود اس نے تعلیم بھی حاصل کی اور آخر با عزت طور پر زندگی بسر کرنے میں کامیاب

ہوگیا۔ وہ اکثر اپنے سامعین کو یہ باور کراتا کہ میں آپ ہی میں سے ہوں اور آپ کی مشکلات کو بہتر طور پر سمجھتا ہوں کیونکہ اسی قسم کے حالات سے گزر چکا ہوں اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہوتا کیونکہ وہ اپنے عوام کی امنگوں اور آرزؤں میں برابر کا شریک ہوتا اور ملک و قوم کے غیر محدود وسائل اور صلاحیتوں پر اُسے پورا یقین ہوتا تھا۔

جھونپڑے سے ایوانِ صدر تک پہنچنا بظاہر تو بہت آسان نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ بہرحال ایک حد تک اس میں سچائی ضرور ہے۔ کیونکہ پہلے چھ صدروں کے بعد جن میں سے چار ورجینیا کے خوشحال گھرانوں سے اور دو میساچوسٹس سے تعلق رکھتے تھے۔ —— ریاست ہائے متحدہ کے بیشتر صدر ایسے ہیں جن کی ابتدائی زندگی زیادہ خوش حال نہ تھی بعض مثلاً جیکسن۔ ولیم ہنری ہیریسن اور ابراہام لنکن درحقیقت جھونپڑوں میں پیدا ہوئے اور اسی ماحول میں ان کا بچپن گذرا بعض کے حالات کچھ بہتر تھے لیکن انیسویں صدی کے اختتام تک کوئی ایک صدر بھی ایسا نہ تھا جس نے دولت کی آغوش میں آنکھ کھولی ہو۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد صرف دو صدر ایسے ہوئے ہیں جو دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ وہ پرانا زمانہ اور اس کی علامت یعنی جھونپڑا اب تاریخ کے دھندلکوں میں داستانِ ماضی بن چکا ہے تاہم امریکی سیاست اب بھی ایک کھلا میدان ہے اور اس کا دامن اب بھی وسیع ہے گذشتہ چار صدارتی انتخابات میں دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کا صرف ایک ایک امیدوار

ایسا تھا جس کے خاندان کو تین پشتوں سے دولت مند کہا جا سکتا ہے۔ صدر
ٹرومین سیاست میں آنے سے پہلے کوئی زیادہ کامیاب کاروباری آدمی نہیں
تھے۔ ٹامس ای ڈیوئی۔ صدر آئزن ہاور اور ریچرڈ ایم نکسن عام متوسط گھرانوں
سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ صدر کینیڈی کا خاندان اب متمول ہے لیکن اگر
صرف دو پشت پیچھے نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ ترک وطن کر کے ایک خاندان
امریکہ پہنچا اور اس نے آخرکار سیاست اور کاروبار میں کامیابی حاصل کی۔

نئے آبادکار اور سیاست

کینیڈی خاندان امریکی معاشرے کی ایک عام مثال ہے۔ امریکہ میں
نووارد خاندانوں میں سے بہت سے ایسے تھے جنھوں نے اپنے نئے وطن
میں بہتر زندگی گذارنے کے لیے سیاست کا انتخاب کیا۔ یورپ سے ترک وطن
کر کے امریکہ میں آباد ہونے والوں کے لیے انیسویں صدی میں بعض دوسرے
پیشوں کے دروازے بند تھے۔ البتہ سیاست کا میدان سب کے لئے
کھلا تھا۔ آئرلینڈ سے آنے والوں کو بعض اوقات نووارد ہونے کی وجہ سے
اور کبھی اپنے کیتھولک[1] عقیدے کے باعث مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن

---

[1] مذہبی تعصب سے امریکی نظام حیات کبھی پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا البتہ ۱۹۶۰ میں صدر کینیڈی
کے انتخاب سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ کیتھولک عقیدہ ملک کے بلند ترین منصب تک
پہنچنے میں حائل نہیں رہا۔

یہ لوگ سیاست میں غیر معمولی طور پر کامیاب ثابت ہوئے۔ شہری سیاسی
تنظیمیں ووٹ حاصل کرنے اور انتخابی معاملات کی خاطر انہی نوواردوں کی مدد
چاہتی تھیں چنانچہ آئرلینڈ سے آنے والے ان نوواردوں نے سیاسی پارٹیوں
میں شامل ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ اپنے لیے بلند مقام حاصل کر لیا۔ انیسویں
صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں مشرقی امریکہ کے شہروں میں
آئرلینڈ کے نوواردان کی نئی پود بیشتر بڑی سیاسی تنظیموں پر چھا گئی تھی لیکن
دوسری نسل میں جوں جوں تعصب اور تنگ نظری ختم ہوتی گئی ان آئرستانی
نوواردوں کے بچے مختلف شعبوں میں منتقل ہوتے گئے اور کئی شہروں اور قصبوں
میں یورپ کے دوسرے ملکوں سے آنے والے لوگوں نے سیاسی لیڈروں
کی حیثیت سے ان کی جگہ لینی شروع کر دی۔ صرف یہ نووارد ہی نہیں بلکہ
کئی دوسرے لوگ بھی ذاتی منفعت اور جماعتی فائدے کے لیے سیاست
سے منسلک ہو گئے۔ مثال کے طور پر گزشتہ چند برسوں میں نیگرو باشندوں
نے جن کے ووٹ قومی، ریاستی اور مقامی انتخابات میں خاص اہمیت
رکھتے ہیں، شمالی شہری مراکز کی سیاسی زندگی میں دلچسپی لینے اور حصہ لینا
شروع کر دیا ہے۔

امریکی نظام حیات میں مخلوط گروپ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اُن
چند شہروں اور ریاستوں میں جہاں پارٹی لیڈر اپنی پسند کے امیدوار منتخب
کرنے کی طاقت رکھتے ہیں وہاں یہ پرانا دستور ہے کہ ووٹروں کے سامنے
امیدواروں کی ایک "متوازن" فہرست پیش کی جائے۔ اس "متوازن"

فہرست میں علاقے کے ہر بڑے گروپ سے اعلیٰ ریاستی اور قومی عہدوں کے لئے امیدوار شامل کئے جاتے ہیں۔ ریاست کنکٹی کٹ میں جہاں گذشتہ سو برس میں لاکھوں آدمی باہر سے آکر آباد ہوئے ہیں ڈیموکریٹک اور ریپبلکن دونوں پارٹیاں عام طور سے ایسے امیدوار نامزد کرتی ہیں جن کے آباؤ اجداد آئرلینڈ اٹلی اور پولینڈ سے آکر آباد ہوئے تھے۔ دونوں پارٹیاں کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور یہودی امیدواروں کو بھی اہم ریاستی عہدوں کے لیے نامزد کرتی ہیں۔ گویا دونوں پارٹیاں قومی زندگی کے ہر شعبے کی نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ رابرٹ ڈاہل کا کہنا ہے کہ ہر گروپ کی نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش اور کنکٹی کٹ کے ووٹروں نے یکساں قومی پس منظر رکھنے والوں کی جو حمائت کی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکی ووٹروں کے لئے طبقاتی سیاست میں کوئی کشش نہیں ہے۔ [۱]

قومیت کے حامل گروہوں میں اب سے کچھ عرصہ پہلے جو کشش تھی وہ اب باقی نہیں رہی تاہم ملک کے بعض حصوں میں اب بھی اس کی اہمیت باقی ہے امریکی سینٹ اور ایوان نمائندگی کے اراکین کے ناموں کی جانچ پڑتال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ممبروں کے آباؤ اجداد یورپ کے تقریباً ہر ملک سے آئے تھے۔ اسی طرح کانگریس کے دونوں

---

[۱] رابرٹ اے ڈاہل کی کتاب حاکم کون ؟ Who Governs.
(نیوہیون ییل یونیورسٹی پریس ۱۹۶۱ صفحہ ۱۱۴)

ایوان میں ایسے ممبر بھی ہیں جن کے آباؤ اجداد لاطینی امریکہ کے رہنے والے تھے کچھ عرصے سے ایسا کانگریس کے ممبر دل ہیں۔۔ ایسے لوگ بھی نظر آنے لگے ہیں جن کے بزرگ ایشیائی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ریاست ہوائی نے چینی نسل کے ایک شخص کو امریکی سینٹ کا اور جاپانی نسل سے ایک آدمی کو ایوان نمائندگان کا ممبر چنا ہے۔ کیلی فورنیا سے ایک عربی نژاد کانگریس کا ممبر بنا ہے اور ایک ممبر ایسا ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور وہیں اُس نے تعلیم پائی۔ بعض مغربی ریاستوں کے اصحاب بڑے فخر کے ساتھ یہ کہتے ہیں۔ کہ ان کی رگوں میں امریکی انڈین خون دوڑ رہا ہے۔

کانگریس کے ممبروں کا پس منظر

امریکی کانگریس کے ممبر مختلف گروہوں ہی سے نہیں بلکہ مختلف اقتصادی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈانلڈ میتھوز نے ۱۹۵۰ سے ۱۹۶۰ تک سینٹ کے ممبروں کے حالات کا تفصیلی مشاہدہ کر کے اعداد و شمار تیار کئے ہیں اور بتایا ہے کہ جو لوگ آج بقول شخصے دنیا کے انتہائی طاقتور قانون ساز ادارے کے رکن ہیں ان کے آبا و اجداد کیا کام کرتے تھے اُن کی تحقیقات کے مطابق ان اراکین کے آبا و اجداد کے مشاغل مختلف تھے اور ان میں وکیل۔ ڈاکٹر۔ پادری پروفیسر۔ انجینئر۔ صحافی۔ معلم۔ شاعر۔ سرکاری ملازم۔ صنعت کار۔ ناشر۔ تاجر۔ بینک، انشورنس یا جائیداد کا لین دین کرنے والے ایجنٹ

تعمیراتی ٹھیکہ دار۔ ریلوے افسر، کسان، سیلزمین۔ اسٹور کلرک۔ طابع بڑھئی پلمبر۔ حجام۔ سینگار ساز۔ درزی۔ جہازوں کے مستری لوہا۔ دبان اور مزدور سب ہی شامل تھے [51]

سینٹ کے اکثر اراکین ابتداء میں خود بھی چھوٹے موٹے کام کرتے رہے لیکن سیاسی عہدے پر منتخب ہوتے وقت اُن میں سے بیشتر وکیل۔ تاجر کاشتکار پروفیسر یا کسی دوسرے پیشے میں صاحب حیثیت تھے۔ ان میں اکثر سینیٹ کا رکن منتخب ہونے سے پہلے کسی ریاستی عہدے پر یا ایوان نمائندگان کے ممبر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔

ایوان نمائندگان اور ریاستی اداروں کے اراکین کا بھی پس منظر تقریباً وہی ہے جو سینیٹ کے ممبروں کا ہے البتہ ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو منتخب ہونے سے پہلے کاشتکار تھے یا ٹریڈ یونین کے ممبر اور کارکن رہ چکے تھے۔ جن ریاستوں میں شہری آبادی زیادہ ہے وہاں خاص طور سے قانون ساز اداروں میں ٹریڈ یونین ممبروں کی تعداد زیادہ ہے

پس مندرجہ بالا امور سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ امریکہ میں ہر طرز زندگی ہر مذہب وعقیدہ اور ہر بڑے مخلوط گروپ سے تعلق رکھنے والے لوگ پبلک عہدوں پر منتخب ہوتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ یہ لوگ ابتداء میں پارٹی کی نامزدگی کے لئے کس طرح چُنے جاتے ہیں؟ اس سوال پر تفصیلی بحث تو چھٹے باب میں ہوگی فی الحال مختصر طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ نامزدگی کا طریق کیا ہے۔

---

[51] ڈانلڈ آر میتھیوز "امریکی سینیٹر اور ان کی دنیا"
دی چاپل ہل یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا پریس ۱۹۶۰ صفحہ ۲۱

اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ باہر سے آکر آباد ہونے والے بہت سے لوگوں نے اثر و رسوخ سے عہدوں تک پہنچنے کے لیے سیاست کا راستہ اختیار کیا۔ ان میں سے کئی مشرقی شہروں میں اپنی سیاسی پارٹی کے روایتی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے برسر اقتدار آئے۔ انہوں نے پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ مل کر کام کیا، دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت کا ثبوت دیا اور عوامی مقررکی حیثیت سے نام پیدا کیا، شہرت اور تجربے میں اضافے کے ساتھ وہ ترقی کرتے ہوئے شہری ریاستی اور قومی عہدوں پر جا پہنچے اگرچہ رسمی طور پر سیاسی ترقی اور عروج اب پارٹی لیڈروں کے اختیار میں نہیں رہا لیکن تقریباً نصف درجن بڑے شہروں اور چند کم تر شہری علاقوں میں نامزدگی کا غیر رسمی طریقہ کار اب بھی ریاستی اور مقامی پارٹی لیڈروں کے فیصلوں پر منحصر ہے۔

نامزدگیاں

بیشتر ریاستوں میں نامزدگیوں کا فیصلہ صرف پارٹی لیڈر نہیں کرتے ہر شہری جو باقاعدہ ووٹر ہے کسی بھی پبلک عہدے کے لیے نامزدگی حاصل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ریاستی قانون کے مطابق عمر اور رہائش وغیرہ کی مقررہ شرائط پر پورا اترتا ہو۔ اگر کوئی نوجوان یہ فیصلہ کرے کہ وہ قومی خدمت کرنا چاہتا ہے اور درحقیقت کر بھی سکتا ہے تو اسے صرف اپنے امیدوار ہونے کا اعلان کرنا ہوتا ہے اور کسی بھی عہدے کے لیے اپنی پارٹی سے نامزدگی

کی درخواست کرسکتا ہے۔ بعض اوقات وہ چند دوسرے شہریوں کے
دستخطوں سے اپنی تائید میں کوئی درخواست بھی حاصل کرسکتا ہے۔ کبھی
ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسے سرکاری ابتدائی فہرست میں اپنا نام درج کرانے
کے لیے معمولی سی فیس دینی پڑتی ہے اگر اسے براہ راست ابتدائی فہرست

میں اپنا نام درج کرانے کے لیے معمولی سی فیس دینی پڑتی ہے۔ اگر اسے
برائے راست ابتدائی رائے شماری میں حصہ لینے والوں کی اکثریت
کی تائید حاصل ہوجاتی ہے تو اگلے نومبر میں اس کا نام عام انتخابات میں
پارٹی کے نامزد امیدوار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اگر عام انتخابات
میں اسے اکثریت کی تائید حاصل ہوجائے تو وہ پبلک عہدیدار بن جاتا ہے
پارٹی کا کوئی لیڈر اسے ابتدائی انتخاب میں حصہ لینے سے نہیں روک سکتا اور
اگر وہ پارٹی کے ممبروں کی اکثریت کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے
تو پارٹی لیڈر اس کی نامزدگی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ ہزار ہا مرد و زن
پارٹی لیڈروں کی پشت پناہی کے بغیر نامزدگیاں حاصل کرچکے اور سیلکٹڈ ہو

نامزدگی کے بعد انتخابات جیت چکے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پارٹی
لیڈروں کی طرف سے نامزدگی کی مخالفت کے باوجود کئی لوگوں کو ابتدائی رائے شماری
میں کامیابی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی ریاستوں میں پارٹی لیڈر مقامی عہدوں بلکہ ریاستی
قانون ساز اداروں کی رکنیت کے لیے بھی کسی کی نامزدگی پر اثر انداز ہونے کی قطعاً
کوشش نہیں کرتے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ ۵۰ ریاستوں کا وفاق ہے اور ظاہر ہے کہ اس
لحاظ سے ہزاروں لاکھوں عہدے ایسے ہیں جن کے لیے امریکی باشندے کوشش
کر سکتے ہیں۔

مساوی نمائندگی کے اصول کے نتیجے میں جو اینڈریو جیکسن کے عہد کے بعد
ملک میں رائج ہوا۔ امریکی باشندے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہزاروں
شہروں اور دیہات میں سے ہر ایک میں بارہ سے زیادہ عہدیدار منتخب کرتے
ہیں پھر کاؤنٹی کے عہدوں کے لیے کوئی آدھے درجن اور عہدیداروں کا انتخاب
کیا جاتا ہے۔ ہر ریاست میں دو ایوانوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ البتہ نبراسکا
میں صرف ایک ایوان کے ممبر منتخب کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکی
باشندے صرف گورنر ہی کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ ریاست کے بیشتر
اہم انتظامی عہدیدار بھی منتخب کیے جاتے ہیں۔ آخر میں قومی سطح پر وہ کانگریس
کے اراکین اور صدر کا انتخاب کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سیاسی سرگرمیوں میں
حصہ لینے والے مرد و زن کے لیے حیرت انگیز حد تک بڑی تعداد میں عہدے
موجود ہیں۔ بیشتر لوگ حجاب یا احتیاط کے پیش نظر ابتدا میں مقامی سطح پر نسبتاً
چھوٹے عہدوں کے انتخاب میں حصہ لیتے ہیں۔ بیشتر ریاستوں میں نچلی سطح
سے سیاسی سیڑھی کی بلندی پر پہنچنا عام قاعدہ ہے۔ اور اس دوران
میں انسان نئے دوست بناتا اور نیک نامی میں شہرت حاصل کرتا جاتا ہے۔
بعض لوگ البتہ اعلیٰ تر سطح سے اپنی مہم کا آغاز کرتے ہیں اور ریاستی عہدوں
یا کانگریس کی رکنیت کے لیے انتخاب لڑتے ہیں۔ بعض سیاسی میدان

میں یک لخت بھی ترقی حاصل کر چکے ہیں۔ نہایت قلیل تعداد میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھوں نے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے سے پہلے کسی منتخب عہدے پر کام نہیں کیا۔ مثال کے طور پر جنرل آئزن ہاور اور ۱۹۴۰ء کے صدارتی امیدوار وینڈل ایل ولکی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جو کمتر عہدوں پر منتخب ہوئے بغیر اعلیٰ ترین عہدے کے لیے نامزد ہوتے ہیں تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے اور وہ یہی ہے کہ انہیں کسی دوسرے میدان میں قومی عظمت و شہرت حاصل ہو چکی ہوتی ہے۔ امریکہ میں ہر بالغ فرد سیاسی پارٹیوں کا ممبر بن سکتا ہے ہر شخص جو ووٹر ہے اپنی پسند کی کسی بھی بڑی پارٹی میں شامل ہو کر پارٹی کے نامزد امیدوار کے انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے۔ کوئی پارٹی لیڈر کسی بھی مرحلے پر پارٹی میں اس کی شمولیت پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ قانون کے تحت پبلک عہدیدار پارٹی ممبروں کے رجسٹریشن کا ذمہ دار ہوتا ہے صرف ووٹر کے کہنے پر کہ اس کا نام ریپبلکن کی حیثیت سے درج کر لیا جائے پبلک عہدیدار کو اس حیثیت سے اس کا نام رجسٹر کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح کوئی ووٹر خود کو ڈیموکریٹک پارٹی کا ممبر رجسٹر کرا سکتا

مختلف ریاستوں میں رجسٹریشن کے قوانین کا اطلاق صرف بڑی پارٹیوں پر ہوتا ہے صرف دو ہی پارٹیاں براہِ راست ابتدائی قوانین کے تحت آتی ہیں جنھیں گذشتہ انتخاب میں مجموعی ووٹوں کی تعداد حاصل ہو چکی ہو۔ چونکہ چھوٹی پارٹیوں کو عموماً ضروری تعداد میں ووٹ نہیں ملتے اس لیے وہ براہِ راست ابتدائی قوانین یا رجسٹریشن کے قوانین کے تحت نہیں آتیں۔

نام درج کرانے کے بعد یہ ووٹر اِس بات کے حقدار ہو جاتے ہیں کہ اپنی پارٹی کے امیدوار کی نامزدگی کے لیے ابتدائی رائے شماری میں حصہ لیں۔ شہریوں کو اپنی پسند کی کسی بھی بڑی پارٹی میں شمولیت کی یہ آزادی امریکی سیاست کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس سے بیشتر علاقوں میں پارٹی لیڈروں کے اختیارات کمزور ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی شہریوں کو نامزدگی اور انتخابات میں زیادہ حصے لینے کا موقعہ ملتا ہے جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس طریقے کی بدولت افراد کو سیاست میں حصہ لینے اور عوامی معاملوں پر اپنی اور اپنے ووٹروں کی رائے کے مطابق ووٹ دینے کی مکمل آزادی ہے۔

ووٹروں کی بھاری ذمہ داریاں

ووٹروں کی نامزدگی اور انتخابات کی کارروائیوں میں حصہ لینے کی آزادی اُن پر اہم ذمہ داریاں بھی عائد کرتی ہے۔ اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ اِس آزادی سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو انہیں اس کے لیے اپنا خاصا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ بیشتر عہدوں کی معیاد مختصر ہوتی ہے۔ امریکی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عوام نے ٹامس پین (THOMAS PAINE) کے اِس مقولہ کو اپنا لیا ہے کہ "جہاں سالانہ انتخابات نہیں ہوتے وہاں ظلم و ستم کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے"۔ امریکہ میں اگرچہ اب بہت کم عہدوں کی مدت ایک سال ہوتی ہے۔ لیکن لمبی معیاد کے عہدے بھی بہت ہی کم ہیں۔ صدر کا انتخاب چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ امریکی سینیٹ کے اراکین چھ سال کے لیے منتخب

ہوتے ہیں بعض ریاستوں کے گورنر دو سال اور بعض کے چار سال تک کام کرتے ہیں۔ دوسرے بیشتر انتخابی عہدوں کی مدت دو سال سے زیادہ نہیں ہوتی، اگرچہ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ریاستی اور قومی انتخابات مقامی انتخابات سے نہ ٹکرائیں پھر بھی ووٹروں کو کم از کم سال میں دو مرتبہ ضرور ووٹ دینے پڑتے ہیں۔

امریکی ووٹروں کے لیے یہ معمول بن چکا ہے کہ پارٹی کے ابتدائی انتخابات طاق برسوں کے موسم بہار میں ہوتے ہیں ان میں مقامی عہدوں کے لیے امیدوار نامزد کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد موسم خزاں میں عام انتخابات ہوتے ہیں جن میں ان امیدواروں میں سے عہدیدار چنے جاتے ہیں جن کی نامزدگی سال کے شروع میں ہوئی ہوتی ہے۔ تمام جفت برسوں میں ایوان نمائندگان کے ممبروں کی نامزدگی اور پھر ان کا انتخاب ہوتا ہے۔ صدر، ریاستی گورنر اور دوسرے اعلیٰ ریاستی عہدیدار ایک ہی سال میں منتخب نہیں کیے جاتے کیونکہ بعض امریکیوں کے خیال میں قومی سیاست کو ریاستی انتخابات پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۶۰ میں کیلی فورنیا کے ووٹرنے دوسرے امریکی باشندوں کے ساتھ صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور ۱۹۶۲ میں انہوں نے اپنے اعلیٰ ریاستی عہدوں کے لیے امیدوار نامزد اور پھر منتخب کئے۔

امریکی سیاست میں حصہ لینے کے لیے سیاسی پارٹیاں اور انتخابات ہی اکیلا ذریعہ نہیں ہیں۔ اگرچہ مختلف مفادات کی حامل تنظیمیں پبلک عہدیداروں

کے لیے اپنے امیدوار کھڑے نہیں کرتیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ قومی اور
ریاستی سیاسیات میں بڑا اہم کردار انجام دیتی ہیں۔ اس قسم کی تنظیموں کے سینکڑوں
عہدوں کے لیے درحقیقت ہزاروں افراد کوشاں رہتے ہیں ہم ان تنظیموں
کا مفصل تذکرہ تو کسی آئندہ باب میں کریں گے لیکن اس مرحلے پر یہ بتانا چاہتے
ہیں کہ آبادی کے ہر طبقے کے مفاد کی حفاظت کے لئے باقاعدہ تنظیمیں قائم
ہیں جو اقتصادی اور سماجی امور کے بارے میں حکومت کے فیصلوں پر اثر
انداز ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر یونائٹڈ اسٹیل ورکرز یونین کوئی
چھ لاکھ مزدوروں کی نمائندگی کرتی ہے۔ واشنگٹن کے علاوہ اُن ریاستوں کے
دارالحکومتوں میں جہاں فولاد تیار ہوتا ہے۔ اس یونین کے باقاعدہ دفاتر قائم ہیں
یہ دفاتر دو اہم سیاسی کام کرتے ہیں اول یہ کہ وہ پبلک عہدوں پر ویسے لوگوں
کو منتخب کرانے کی کوشش کرتے ہیں جنھیں عموماً مزدور تنظیموں سے ہمدردی
ہوتی ہے۔ دوسرے یہ دفاتر یونین کے ممبروں کو ضروری معلومات فراہم کرنے اور
ان کے مفاد کے لئے اہمیت رکھنے والے معاملوں کے بارے میں قانون ساز
اور انتظامی حکام کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کا پروگرام بناتے ہیں۔ اگرچہ
بیشتر گروپوں کے پاس اسٹیل ورکرز یونین کی طرح رقم اور وسیع وسائل
نہیں ہیں لیکن وہ اپنے اپنے دائرۂ عمل میں ایسی پالیسیاں وضع کرانے کی سرگرمی
کے ساتھ کوشش کرتے ہیں جو اُن کے لیے مناسب ہوں۔ مندرجہ بالا تمام
امور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ امریکی سیاست ایک وسیع میدان ہے جس میں ہر شخص
خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو بڑی آزادی کے ساتھ حصہ لے سکتا ہے۔

اور اسے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے اظہار کا بڑا اچھا موقعہ ملتا ہے کسی انتخابی عہدے کے لیے خود امیدوار بننا ہو یا کسی دوسرے امیدوار کی حمایت کرنا۔ عمومی رنگ میں ملک کی خدمت کرنا ہو یا کسی مخصوص مفاد کی حفاظت بہر حال امریکی عوام کو ہر رنگ میں سیاست میں حصہ لینے کی پوری آزادی ہے۔

آئندہ ابواب میں ہم دو ٹروں۔ اُن کی نوعیت اور اُن کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیں گے۔ اس کے بعد مختلف مفادات کے حامل گروہوں اور سیاسی پارٹیوں کی نوعیت اور اُن کے کام پر روشنی ڈالی جائے گی۔ پھر مختصر طور پر یہ بتایا جائیگا کہ امریکہ کے پارٹی سسٹم کی بدولت کیا نتائج مترتب ہوتے ہیں اور حکومت کے فیصلے کس طرح کئے جاتے ہیں اور آخر میں ہم ایک طرف تو امریکی صدارت کے لیے نامزدگی اور انتخاب کی نوعیت اور دوسری طرف دوسرے تمام سیاسی عہدوں کی نامزدگی اور انتخاب کا جائزہ لیں گے۔

۲

ووٹر

امریکی ووٹروں کی فہرست میں ۲۱ سال سے زیادہ عمر کے وہ تمام باشندے شامل ہیں جو کسی خاص ریاست میں ایک خاص مدت تک رہائش رکھتے رہے ہوں۔ یہ مدت کسی ریاست میں تین ماہ ہے تو کسی میں دو سال اگرچہ اس میں کئی مستثنیات بھی ہیں تاہم ووٹروں کی یہ سیدھی سادی تعریف کافی جامع ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ووٹروں کی یہی تعریف زیادہ صحیح تصور کی جا رہی ہے۔ اس جگہ استثنائی مثالیں دینے کی بجائے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ۱۷۸۹ میں امریکی دستور کی منظوری کے بعد سے اب تک امریکی ووٹر کی تشکیل و توضیح کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیا جائے۔

رائے دہندوں پر کم سے کم مرکزی کنٹرول

دستور میں قومی عہدیداروں کے انتخاب سے متعلق صرف تین اشارے ہیں۔ اول یہ کہ ایوان نمائندگان کے ممبروں کو ووٹ دینے کے لیے "ہر ریاست میں ووٹروں کی اہلیت وہی ہونی چاہیے جو ریاستی قانون ساز ادارے کی سب سے زیادہ تعداد والی شاخ کے ووٹروں کے لیے مقرر ہے۔" دوسرے اس میں کہا گیا ہے کہ سینیٹ کے ممبروں کا انتخاب ایک درمیانہ گروپ کرے گا جسے "صدارتی ووٹر" کہا جائے گا۔ یہ

صدارتی ووٹر ہر ریاست میں اس طرح چنے جائیں گے جس طرح اُس ریاست کا قانون ساز ادارہ ہدایت دے گا"۔ اگر یہ صدارتی ووٹر جو تمام ریاستوں کے نمائندے ہوں گے کہیں ایک امیدوار کے حق میں کثرتِ رائے سے فیصلہ نہ کر سکیں تو صدر کا انتخاب ایوانِ نمائندگان پہلے پانچ امیدواروں میں سے کرے گا[ل] ایوانِ نمائندگان میں ہر ریاست کو صرف ایک ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گا۔

اِن دفعات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انفرادی طور پر اس بات کا فیصلہ ریاستیں کریں گی۔ کہ قومی عہدیداروں کے لیے کون ووٹ دے سکتا ہے اور کون نہیں دے سکتا۔ آج تک یہی صورتِ حال قائم ہے۔ البتہ اس سلسلے میں دستور میں صرف دو یعنی پندرھویں اور انیسویں ترمیمیں کی گئی ہیں۔ ان میں کہا گیا ہے کہ ریاستوں کو نسل یا صنف کی بنیاد پر کسی فرد یا گروپ سے امتیازی سلوک نہیں کرنا چاہیے۔

پس (ان دو ترمیموں کے سوا) حقِ رائے دہندگی کی تاریخ پر بحث ریاستوں میں قانونی تبدیلیوں پر بحث کے مترادف ہے۔ قومی حکومت مناسب قانون سازی

ل دستور کی اس دفعہ کا یہ آخری حصہ ۱۸۰۴ء میں بارھویں ترمیم کے ذریعے بدل دیا گیا اس ترمیم میں دوسری باتوں کے علاوہ کہا گیا ہے کہ ایوانِ نمائندگان پہلے تین امیدواروں میں سے صدر کا انتخاب کرے گا اس کے ذریعے صدارتی امیدوار کے لیے ووٹ دینے کے طریقے میں بھی تبدیلی کی گئی ہے یہ تبدیلی سیاسی پارٹیوں کے اُبھرنے کی وجہ سے ضروری ہو گئی تھی۔

کے ذریعے ان ترمیموں پر عملدرآمد کر سکتی ہے لیکن وہ ایسے ریاستی قوانین میں مداخلت نہیں کرے گی جو اپنی نوعیت اور انتظامی حیثیت سے کسی کے خلاف امتیازی برتاؤ کے حامل نہیں ہیں

ہم دوسرے ابواب میں حق رائے دہندگی پر ریاستی کنٹرول اور انتخابات کی اس اہمیت پر بحث کریں گے جو انتخابی طریقہ کار کی نوعیت اور امریکہ کی سیاسی پارٹیوں کے سلسلے میں اسے حاصل ہے۔ لیکن مختصر طور پر یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاستوں کو حاصل شدہ ان ابتدائی اختیارات کی وجہ سے ملک بھر میں انتخابی روایات کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کی بڑی سیاسی پارٹیوں کے اندر اختیارات کی درجہ بندی میں بھی اس کا بڑا حصہ ہے۔

سفید فام مردوں کا حق رائے دہی

دستور کی منظوری کے وقت امریکہ کے بیشتر سفید فام بالغ مردوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ ریاستوں میں عام طور پر یہ قاعدہ تھا کہ ووٹر وہی ہو سکتا تھا۔ جو صاحب جائیداد ہو یا کچھ رقم ٹیکس کے طور پر دیتا ہو۔ لیکن ایک ایسے وسیع اور کم آبادی والے ملک میں جہاں ۴۰ ہزار کی آبادی کا صرف ایک شہر ہو۔ یہ بات نسبتاً آسان تھی کہ کوئی شخص انتخابات میں حصہ لینے کا حق حاصل کرنے کی غرض سے ضروری جائیداد حاصل کرے [1]

---

[1] یہ نظریہ اس نقطہ نظر کے خلاف ہے جس کا ذکر حق رائے دہندگی کی تاریخ میں اس سے پہلے

(اگلے صفحہ پر)

دستور کی منظوری کے بعد کے برسوں میں جب مشرقی علاقوں میں شہر بسنے شروع ہوئے تو حق رائے دہندگی کے لئے صاحب جائیداد ہونے کی یہ پابندیاں اور زیادہ اہمیت اختیار کر گئیں۔ شہروں کے وجود میں آنے کے ساتھ ایسے لوگوں کا ایک چھوٹا طبقہ پیدا ہو گیا جن کی کوئی جائیداد نہیں تھی۔ یہ مزدور لوگ اُن دنوں "مستری" کہلاتے تھے۔ ابتدا میں جیفرسن جیسے اعتدال پسند سیاسی لیڈروں کو بھی اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر ان کو حق رائے دہندگی حاصل ہو گیا تو وہ بڑی طاقت بن جائیں گے۔ لیکن جب ان کی تعداد بڑھی تو اس کے ساتھ ہی ریاستی قانون ساز اداروں پر بھی دباؤ بڑھنے لگا کہ حق رائے دہندگی کے لئے صاحب جائیداد ہونے کی شرط ہٹا دی جائے۔ کچھ عرصے تک تو مشرقی علاقوں کے قانون ساز ادارے اس دباؤ کا مقابلہ کرتے رہے لیکن آخر کب تک۔

اُدھر مغربی علاقوں کی طرف نو آبادکاروں کی بڑھتی ہوئی توجہ کے نتیجے میں کئی نئی ریاستیں قائم ہو کر یونین میں شامل ہوئیں یہ ریاستیں جو اب وسطی۔ مغربی ریاستیں کہلاتی ہیں۔ ایسے لوگوں پر مشتمل تھیں جو اس علاقے میں پہنچتے ہی زمینوں

ہوتا رہا ہے۔ لیکن تازہ مشاہدہ سے یہ نظریہ صحیح ثابت ہوا ہے۔ اس سلسلے میں چلٹن ولیمسن کی کتاب "امریکی حق رائے دہندگی۔ جائیداد سے جمہوریت تک American Suffrage from Property to Democracy 1760-1860-1960" مطبوعہ پرنسٹن یونیورسٹی پریس بہت مفید ہے۔

کے مالک بن گئے تھے۔ یہاں کسی طبقاتی امتیاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا یہاں دولت مند کوئی نہیں تھا۔ اور سب خاندان کم و بیش اپنا اناج پیدا کرتے یا شکار کے ذریعے خوراک حاصل کرنے کے معاملے میں خود کفیل تھے۔ ٹیکس بہت کم تھے کیونکہ ریاستی حکومتوں کے فرائض بہت محدود تھے۔ ان حالات میں حق رائے دہی کے لیے جائیداد یا ٹیکس کی پابندی لگانا بالکل بے معنی تھا پس عمر اور رہائش کی بعض پابندیوں کے علاوہ ریاست اوہایو کے سوا دوسری تمام نئی ریاستوں میں سفید فام مرد باشندوں پر حق رائے دہندگی کے سلسلہ میں کوئی پابندی نہیں تھی۔

مغربی ریاستوں میں سفید فام مردوں کے حق رائے دہندگی کی وجہ سے پرانی مشرقی ریاستوں میں بھی اس بات کی تحریک شروع ہو گئی کہ سفید فام مردوں کو ووٹ دینے کا حق ملنا چاہیے۔ اس تحریک نے جو انیسویں صدی کی ابتدا میں شروع ہوئی تھی۔ اینڈریو جیکسن کے عہد میں زیادہ زور پکڑا۔ مشرق میں بعض صاحب جائیداد لوگوں کی مخالفت کے باوجود سنہ ۱۸۳۰ء تک مشرقی ریاستوں میں سفید فام مردوں کو حق رائے دہندگی مل گیا بعض ریاستوں نے یہ پابندیاں ہٹانے میں کچھ دیر کی مثال کے طور پر رہوڈ آئی لینڈ میں ۱۸۴۲ء کے بعد حق رائے دہندگی کے لیے صاحب جائیداد ہونے کی شرط ہٹائی گئی نارتھ کیرولینا میں یہ پابندی ۱۸۵۶ء میں ہٹائی گئی اور اس طرح پورے ملک میں تمام سفید فام مردوں کو حق رائے دہندگی حاصل ہو گیا۔

عورتوں کا حق رائے دہی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی آزادی کے تقریباً سو سال بعد تک خواتین
کو رائے دہندگی دینے کے امکان پر ریاستی قانون ساز اداروں نے کبھی غور
تک نہیں کیا تھا۔ خانہ جنگی سے چند برس پہلے خواتین نے اپنے لئے زیادہ قانونی
مساوات کا مطالبہ شروع کیا اس کے بعد انہوں نے اپنے مطالبات
میں حق رائے دہندگی کا مطالبہ بھی شامل کر لیا لیکن ابھی اس کو زیادہ اہمیت
نہیں دی۔

سب سے پہلے ویومنگ کے علاقہ میں ۱۸۶۹ء میں خواتین کو ووٹ
کا حق دیا گیا عجیب بات یہ ہے کہ اس علاقے کی خواتین نے اس کے لئے
کوئی خاص کوشش بالکل نہیں کی۔ بعد میں گورنر نے بتایا کہ "اس فیصلے سے
خواتین حیران و ششدر رہ گئیں اگر اُن کے مطالبات کی حمایت کے لئے
فرشتوں کی فوج شمشیر بکف بھی اُتر آتی تو بھی خواتین کو اس قدر حیرت ہوتی۔"
جب ۱۸۹۰ء میں ویومنگ کی ایک الگ ریاست بنی تو عورتوں کو
مردوں کے برابر ووٹ کا حق دیا گیا۔ ابھی دس سال بھی گذرنے نہیں پائے
تھے کہ کولوریڈو، اڈاہو اور اوٹاہ میں بھی عورتوں کو یہ حق مل گیا۔ انیسویں صدی
کے آخر تک کوئی ۲۰ ریاستوں میں خواتین کو بعض معاملوں مثلاً پبلک اسکول
وغیرہ کے بارے میں ووٹ کا جزوی حق دیا جا چکا تھا۔ لیکن قومی عہدیداروں
کے لئے ووٹ کا مکمل حق انھیں رفتہ رفتہ دیا گیا

دریائے مسی سپی کے مغرب کی طرف کی سات ریاستوں نے جہاں بڑی پارٹیوں
اور بڑے سرمایہ داروں کے خلاف کسانوں اور چھوٹے تاجروں کی
عوامی تحریک کو سب سے زیادہ زور تھا راکی ماؤنٹین کی چار ریاستوں
کے ساتھ مگر خواتین کو ووٹ کا حق دیا اور اس طرح ۱۹۱۵ تک گیارہ
ریاستوں میں خواتین کو حق رائے دہندگی حاصل ہو گیا مشرقی ریاستیں
البتہ اپنی بات پر اڑی رہیں ۱۹۱۲ سے ۱۹۱۵ تک دریائے میسی سپی کے
مشرق کی طرف کی بارہ ریاستوں میں خواتین کو ووٹ کا حق دینے سے
انکار کیا جاتا رہا۔ اس سوال پر جب بھی ووٹ لئے جاتے بھاری تعداد
میں اس کے خلاف رائے دی جاتی۔ ان ناکامیوں کے نتیجے میں نیویارک
میں خواتین کے لئے حق رائے دہندگی کی پارٹی نے بڑے پیمانے پر مہم
شروع کی پارٹی کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور آخر ۱۹۱۷ میں انھیں
ووٹ کا حق مل گیا۔ نیویارک میں خواتین کا مطالبہ تسلیم ہو جانا پورے
ملک کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھنا تھا ریاست نیویارک پہلے کی طرح
اب بھی صدارتی انتخاب میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے چونکہ اس کے ۴۵
انتخابی ووٹ[1] تھے جو ۱۹۲۰ کے صدارتی انتخاب میں فیصلہ کن ثابت ہو سکتے

---

[1] اب دوسری ریاستوں کی آبادی میں نسبتاً اضافہ ہونے کی وجہ سے نیویارک کے انتخابی ووٹوں کی تعداد ۴۳ ہے لیکن اب بھی یہ تعداد دوسری تمام ریاستوں سے زیادہ ہے اور کسی ریاست کے انتخابی ووٹ اتنے زیادہ نہیں ہیں دوسرے نمبر پر کیلی فورنیا ہے جس کے ۴۰ ووٹ ہیں۔

تھے اس لئے نیویارک میں خواتین کو ووٹ کا مساوی حق ملتے ہی دونوں
بڑی سیاسی پارٹیوں نے دستور کی مجوزہ انیسویں ترمیم کی تصدیق کردی۔
جس میں کہا گیا تھا کہ کوئی ریاست ووٹ کی اہلیت رکھنے والے کسی شہری
کے خلاف اس کی صنف کی وجہ سے امتیاز نہیں برتے گی۔ یکے بعد دیگرے
بہت سی ریاستوں نے اس تجویز کی توثیق کی یہاں تک کہ اگست ۱۹۲۰
تک ۳۶ ریاستیں اس کی توثیق کر چکی تھیں اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے
کے لئے اتنی ہی ریاستوں کی توثیق کی ضرورت تھی۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں
امریکی خواتین نے پہلی مرتبہ قومی عہدے داروں کے انتخاب کے لئے
ووٹ دیا بعض مردوں کے زبردست اندیشوں اور بعض خواتین کی امیدوں
کے برخلاف خواتین کے حق رائے دہندگی کی وجہ سے انتخابات کے نتیجے
میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ ابتدائی برسوں میں مردوں کے مقابلے
میں عورتوں کی بہت کم تعداد ووٹ دینے کے لئے پولنگ اسٹیشن جانے
کی زحمت گوارا کرتی تھی۔ آج بھی خواتین اپنا یہ حق استعمال کرنے میں
مردوں سے کہیں پیچھے ہیں۔ خواتین میں ووٹ نہ دینے کا یہ رجحان جنوبی
علاقے اور بعض شہروں میں خاص طور پر نمایاں ہے اگرچہ سروے وغیرہ
کے نتیجہ میں خواتین کا سیاسی نقطہ نظر مردوں سے کچھ مختلف پایا گیا ہے
لیکن یہ اختلاف اتنا معمولی ہے کہ تقریباً برابر کے مقابلے والے انتخاب
کے سوا اس کی وجہ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ مردوں
کی چونکہ زیادہ تعداد ووٹ دیتی ہے اس لئے بھی خواتین کے اختلاف

رائے کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

نیگرو باشندوں کا حق رائے دہی

زمانہ جنگی سے پہلے نیگرو باشندوں کو صرف چار شمالی ریاستوں میساچوسٹس۔ نیو ہمپشائر، نیو یارک اور ورمونٹ میں حق رائے دہندگی حاصل تھا۔ ایک جنوبی ریاست نارتھ کیرولینا نے کچھ عرصے تک آزاد شدہ نیگرو باشندوں کو حق رائے دہندگی دیا۔ ۱۸۷۰ء میں پندرھویں ترمیم کی توثیق کے وقت تک صرف سات شمالی ریاستوں نے نیگرو باشندوں کو ووٹ کا حق دیا تھا۔

پندرھویں ترمیم میں کہا گیا تھا کہ "امریکی باشندوں کو ریاستہائے متحدہ یا کوئی ریاست نسل رنگ یا سابقہ غلامی کی وجہ سے ووٹ دینے کے حق سے محروم نہیں کرے گی" اس ترمیم کی تجویز اور توثیق کے وقت ابھی شمالی فوجیں جنوب کی سابق وفاقی ریاستوں میں ہی موجود تھیں اس کے بعد تقریباً بیس سال تک جنوبی اور دوسرے علاقوں کے نیگرو باشندوں کو عام طور پر قانونی لحاظ سے ووٹ کا حق حاصل رہا وہ مقامی اور ریاستی عہدوں کے لئے چنے جاتے رہے اور ان عہدوں پر کام بھی کرتے رہے جنوبی علاقوں کے بہت سے سابق غلام نیگرو منتخب ہو کر امریکی کانگریس کے ممبر بھی بن گئے۔

پندرھویں ترمیم کے مفہوم کے بارے میں سپریم کورٹ کے متعدد فیصلے
جنوب میں سفید فام باشندوں کی بعض تنظیموں کے دباؤ اور ان دستوری
دفعات کی وجہ سے جن میں ریاستوں کو ووٹر کی اہلیت مقرر کرنے کا اختیار دیا
گیا تھا انیسویں صدی کے آخر تک سابق جنوبی وفاقی ریاستوں میں بیشتر
نیگرو باشندوں کو حق رائے دہندگی سے محروم کر دیا گیا اس کے علاوہ جب
شمالی فوجوں کا تسلط ختم ہوا تو شمالی علاقوں کے بیشتر اراکین کانگریس کی
اس معاملے میں دلچسپی بھی ختم ہو گئی کانگریس نے جسے "مناسب قانون سازی"
کے ذریعے اس ترمیم کو نافذ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا ۱۸۷۰ کے بعد نیگرو
باشندوں کو ووٹ کا مساوی حق دلانے کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی۔

سپریم کورٹ نے پندرھویں ترمیم کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے
یہ دلیل دی کہ اس ترمیم کے تحت کسی کو ووٹ کا حق نہیں دیا گیا بلکہ ریاستوں
کو کسی خاص نسل کے لوگوں کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھنے کی ممانعت
کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں سپریم کورٹ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ریاست
کے قوانین کو خلاف آئین قرار دیدے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا
ہے کہ جب تک قوانین میں کسی نسل کے خلاف بطور خاص امتیاز کا ذکر نہ ہو
اس وقت تک سیاہ اور سفید فام باشندوں کو یکساں حق حاصل رہتا
ہے۔ عدالت کو اس سے مطلب نہیں کہ یہ قوانین کیوں منظور کئے گئے تھے
اور ان کے نتائج کیا نکل سکتے ہیں۔ آخر میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ
پندرھویں ترمیم کا اطلاق صرف ریاستوں اور ان کے ایجنٹوں پر ہوتا ہے

افراد اور گروپ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

جب سپریم کورٹ نے یہ فیصلے دیدیے تو جنوبی ریاستوں کے مجالس قانون ساز کے لئے یہ بات اور آسان ہوگئی کہ وہ نیگرو باشندوں کو رائے دہی کے حق سے محروم کر دیں اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایسے قوانین منظور کریں جن میں امتیازی سلوک کا یقینی طور پر ذکر نہ کیا جائے۔ چنانچہ ووٹروں کے لئے یہ شرط عائد کر دی گئی کہ وہ دستور اور قوانین کے بارے میں چند سوالوں کا جواب دے کر ووٹر بننے کی اہلیت ثابت کریں۔ عملاً ہوتا یہ تھا کہ الیکشن کے حکام امتیاز روا رکھنے کے لئے سفید نسل کے لوگوں سے آسان اور نیگرو باشندوں سے مشکل سوالات پوچھتے تھے۔ پولنگ کا ایک ٹیکس بھی مقرر کر دیا گیا جس کی ادائیگی نیگرو باشندوں کے بس سے باہر تھی۔ ووٹر بننے کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ وہ متعلقہ ریاست میں دو سال سے سکونت پذیر ہوں۔ نیگرو باشندے کھیتی باڑی کا کام ختم ہو جانے کے بعد ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں گھومتے پھرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے نیگرو حق رائے دہی سے محروم ہو گئے۔ بعض جگہوں پر جائداد کی شرط بھی لگا دی گئی جس کی وجہ سے نیگرو باشندوں کو بہت نقصان ہوا کیونکہ ان کے پاس جائداد کہاں تھی۔

سفید فام باشندوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ووٹر بنانے کے لئے یہ رعایت بھی دی گئی کہ ۱۸۶۸ء سے قبل جو لوگ یا جن کے باپ دادا ووٹ دے چکے ہیں ان کے لئے انتخابی قوانین کی پابندی ضروری

نہیں۔ اس رعائت سے بہتوں کو فائدہ ہوا۔ جہاں تک نیگرو باشندوں کا تعلق تھا صرف چند لوگوں نے ۱۸۶۸ئہ سے پہلے ووٹ دیا تھا۔ آخر کار ۱۹۱۵ئہ میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ ووٹ دینے کے سلسلے میں جو سابقہ مدت کی رعایت دی گئی ہے وہ ایک طرح کا امتیاز ہے اور یہ چیز پندرھویں ترمیم کے منافی ہے

بہرحال جنوبی ریاستوں کی ان شرطوں اور رعائتوں کے سبب نیگرو ووٹروں کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ بعض جگہ پر یہ تعداد ایک تہائی کم ہو گئی خصوصاً ان علاقوں میں جہاں نیگرو باشندوں کی آبادی زیادہ تھی۔ البتہ بڑے شہروں میں کچھ لوگوں کو رائے دہی کا حق حاصل رہا اپنے ووٹوں کی بے مائیگی کے سبب بہت سے نیگرو ووٹر بھی پولنگ اسٹیشن تک نہیں جاتے تھے۔ اسی دوران میں تقریباً تمام جنوبی ریاستوں میں ڈیموکریٹک پارٹی کو غلبہ حاصل ہو گیا اور پارٹی بازی کی وجہ سے بہت سے سفید فام باشندے بھی ووٹ ڈالنے سے گریز کرنے لگے۔ اب بھی جنوبی ریاستوں میں نسبتاً کم ووٹ ڈالے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جنوبی ریاستوں میں نیگرو باشندوں کو ووٹ دینے کا حق تو مل گیا تھا لیکن سفید نسل کے لوگ ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتے تھے کہ وہ تقریباً بیس سال تک اپنا یہ حق صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض ریاستوں کو چھوڑ کر سارے جنوبی علاقے میں نیگرو باشندوں کے ساتھ پچاس سال سے زائد عرصے تک یہی سلوک ہوتا رہا ——

نیگرو باشندوں کے حق رائے دہی کی بحالی

جنوبی علاقوں کے نیگرو باشندے امریکہ کے اس واحد گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جسے ووٹ کا حق ملنے کے بعد بڑی حد تک اس سے محروم کر دیا گیا۔ اس حق کی بحالی کی کوششیں ایک لمبے عرصے سے جاری ہیں لیکن گزشتہ اور حالیہ برسوں میں اس جدوجہد کی رفتار خاصی سست اور صبر آزما رہی ہے آج دونوں بڑی پارٹیوں نے اپنے قومی پروگرام میں سب کے لئے مساوی حق رائے دہندگی کی توثیق کر دی ہے قومی حکومت کے تینوں شعبوں نے پچھلے ۲۰ برس میں ایسے کئی اقدام کئے ہیں جن کی وجہ سے نیگرو ووٹروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ رفتہ رفتہ ملک کے تمام علاقوں میں بسنے والے ہر نسل کے باشندوں کو مکمل اور مساوی سیاسی حقوق حاصل ہو جائیں گے۔

نیگرو باشندوں کو حق رائے دہندگی دلانے کی دوسری تحریک اس صدی کی پہلی دہائی کے خاتمے پر شروع ہوئی اور رنگ دار نسل کے لوگوں کی ترقی کی قومی ایسوسی ایشن[1] کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ایسوسی ایشن

---

[1] نیگرو باشندوں کے حقوق پر زور دینے کے لئے دوسرے گروپ بھی اس ایسوسی ایشن کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے ہیں ان میں شہری لیگ اور نسلی مساوات کی کانگریس کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

نیگرو اور ان کے ہمدرد سفید فام باشندوں نے قائم کی اس کا مقصد نیگرو باشندوں کے لیئے ووٹ کا حق حاصل کرنے کے علاوہ سماجی اور اقتصادی میدانوں میں نسلی مساوات قائم کرنا تھا ابتدا میں اس ایسوسی ایشن کا زیادہ تر کام یہ تھا کہ ضروری رقم جمع کرے اور غیر مساوی برتاؤ کی روک تھام کے لیئے ریاستی اور قومی عدالتوں میں مقدمے دائر کرنے کے لیئے قانونی مشورے مہیا کرے اگرچہ شروع میں اسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی تاہم کسی حد تک ترقی ہوئی۔ سویڈن کے سماجی علوم کے ماہر ڈاکٹر گنٹر مرڈل نے ۱۹۴۰ء میں امریکہ میں نسلی تعلقات کا تفصیلی مطالعہ کیا اُن کا کہنا ہے کہ اس صدی کی تیسری دہائی میں بھی امریکہ میں نیگرو باشندوں کی پوزیشن بہت کم ترقی کی انہوں نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ نیگرو باشندوں کی غربت، تعلیم کی کمی اور ووٹ کا حق نہ ملنے کی وجہ سے ان کے خلاف تعصبات کو تقویت پہنچتی ہے اور اس کے نتیجے میں نیگرو باشندوں کو اپنی حالت سدھارنے میں مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے گویا عصبیت کی وجہ سے نیگرو کی حیثیت گھٹیا ہوئی اور اس گھٹیا حیثیت کی وجہ سے لوگوں کو ان کے خلاف عصبیت کا جواز مل گیا[1]۔ ۱۹۳۰ اور اس کے بعد کے برسوں میں اگرچہ امریکہ کو خاصی کساد بازاری کا سامنا رہا لیکن نیگرو کی حالت کچھ بہتر ہو گئی کساد بازاری

---

[1] گنٹر مرڈل کی کتاب An American Dilemma (نیو یارک ہارپر اینڈ برادرز ۱۹۴۴)

کے اس دور میں قومی حکومت نے بے روزگار لوگوں کی امداد اور انہیں روزگار مہیا کرنے کے لئے ہنگامی تدابیر اختیار کیں۔ نیگرو باشندوں کو پتہ چلا کہ ان قوانین پر عمل درآمد میں ان سے کوئی خاص امتیازی سلوک نہیں کیا جا رہا ہے اس طرح گویا انہیں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ نیگرو باشندوں کی مشکلات کی ناقابل تسخیر دیوار بھی ٹوٹ سکتی ہے اسی عرصے میں سپریم کورٹ نے بھی بعض ایسے فیصلے دیئے جن سے عدالت کی نظر میں نسلی مساوات کی اہمیت ظاہر ہوتی تھی۔

نیگرو باشندوں کی حالت میں بہتری

ڈاکٹر مرڈل کی پیشینگوئی کے عین مطابق نیگرو باشندوں کی حالت بہتر ہوتے ہی ان کے خلاف عصبیت کم ہونا شروع ہو گئی اور اس کے نتیجے میں نیگرو کی حالت مزید بہتر ہونے لگی اوائل ۱۹۴۰ میں حکومت نے ان تمام کمپنیوں کو جن کے پاس دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے کے لئے ملک کی تیاریوں کے سلسلے میں ضروری سامان بنانے کے ٹھیکے تھے ہر قسم کا امتیازی سلوک ختم کرنے کا حکم دیا۔ بعض یونینوں خصوصاً بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے والی صنعتوں سے تعلق رکھنے والی یونینوں نے نیگرو ممبروں کا خیر مقدم کیا۔ فوجی اداروں نے تمام نسلوں کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا چند ہی برسوں میں لاکھوں سفید فام اور نیگرو باشندوں کو ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کے جو مواقع

ملے تو ان کے نتیجے میں باہمی تعصب بڑی حد تک کم ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب کوریا کو کمیونسٹ حملے سے بچانے کے لئے امریکی فوجیں وہاں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی اس وقت تک فوج میں نسلی علٰحدگی ختم کرنے کا مقصد حاصل ہو چکا تھا۔

۱۹۴۰ سے ۱۹۵۰ تک کے عرصے میں سپریم کورٹ نے ان ریاستی قوانین پر کاری ضربیں لگائیں جن میں مکانات اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں نسلی امتیاز کی حمایت کی گئی تھی ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں بچوں کو نسلی بنیاد پر الگ الگ تعلیمی سہولتیں فراہم کرنا اب برداشت نہیں کیا جا سکتا[۵] عدالت نے یہ فیصلہ چودھویں ترمیم کی مساوی حفاظت والی دفعہ کی بنیاد پر دیا اس میں کہا گیا ہے کہ "مساوی حفاظت" کا مطلب یہ ہے کہ تمام نسلوں کے بچوں کو ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے انھیں الگ اسکولوں میں پڑھنے پر مجبور کرنا خواہ وہ اسکول اسی معیار کے ہی کیوں نہ ہوں مساوی حقوق سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

۱۹۵۴ کے بعد سے بیشتر ریاستوں کے اسکولوں میں نسلی علٰحدگی ختم کر دی گئی ہے۔ چند ریاستوں میں البتہ اس تحریک کی رفتار سست ہے تاہم

---

[۵] مقدمہ براؤن و تعلیمی بورڈ ٹوپیکا ۳۴۷ یو ایس ۴۸۳ (۱۹۵۴) اور ۳۴۹ یو ایس ۲۹۴ (۱۹۵۵)

قومی حکومت کے دباؤ کے تحت وہاں نسلی علحدگی ختم ہو رہی ہے۔ بہر حال چند ہی برسوں کے اندر اتنا زبردست تغیر رونما ہوا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر مرڈل نے امریکی نیگرو کے متعلق یہ الفاظ کہے "نیگرو باشندوں کو امریکی معاشرہ میں ضم کرنے کی رفتار کو دیکھتے ہی بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو بات امریکہ کے لئے مفید ہے وہ نیگرو باشندوں کے لئے بھی مفید ہے اور اسی طرح جس بات میں نیگرو باشندوں کا فائدہ ہے اسی میں امریکہ کا بھی فائدہ ہے"

نسلی تعلقات میں بہتری اور سماجی اور اقتصادی میدان میں مساوات کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ تبدیلیاں اس وسیع تر تحریک کا حصہ تھیں جس میں مزید سیاسی مساوات پر زور دیا گیا تھا[1] شمال میں نیگرو کے ووٹوں کی طاقت نے قومی حکومت پر دباؤ ڈالا تاکہ ملک میں ہر جگہ نیگرو باشندوں کی عمومی حیثیت بہتر ہو سکے۔

۱۹۴۴ء کے بعد سیاسی مساوات کے سلسلے میں بڑی نمایاں ترقی

---

[1] اس سے بظاہر کمتر لیکن نیگرو باشندوں کی حیثیت کو بہتر بنانے اور تعصب کم کرنے کے سلسلے میں غالباً اتنا ہی اہم کھیلوں کے مقابلوں میں مساوی طور پر حصہ لیا ہے امریکی بچے اس معاملے میں خاصے آگے ہیں ان کے بیس بال اور فٹبال کے ہیرو کے لئے شاندار کھلاڑی ہونا اول اور سفید یا سیاہ فام ہونا ثانوی حیثیت رکھتا ہے کھیل کے میدان میں مساوی درجے کا نفسیاتی طور پر جو اثر ہوا ہے وہ یقیناً سیاسی اور سماجی میدانوں میں بھی نظر آنے لگا ہے۔

ہوئی اس سال سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ سیاسی پارٹیوں کی طرف سے امیدواروں کی نامزدگی انتخابات کی ہئیت اجتماعی کا ایک حصہ ہے ریاستیں یا سیاسی پارٹیاں نسلی بنیاد پر کسی شخص کو نامزدگی کے معاملے میں شرکت سے روک نہیں سکتیں ۔ ۔ ۔ ۔ عدالت نے خصوصیت سے ڈیموکریٹک پارٹی کے ان انتظامات کو کالعدم قرار دیا جن کی پشت پناہی ریاستیں کر رہی تھیں اور جن کی وجہ سے جنوب میں ڈیموکریٹک پارٹی کی ابتدائی رائے شماری میں حصہ لینے سے نیگرو باشندوں کو روک دیا گیا تھا[۱] سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے پہلے ڈیموکریٹک پارٹی نے جو پون صدی سے جنوب کی سیاست پر چھائی ہوئی تھی ۔ نیگرو باشندوں کو رکنیت سے محروم کر رکھا تھا چونکہ ابتدائی رائے شماری میں صرف ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبر ہی شرکت کر سکتے تھے اور چونکہ ڈیموکریٹک پارٹی کے نامزد امیدواروں کا تقریباً ہر سیاسی عہدے پر منتخب ہونا یقینی ہوتا تھا اس لئے نیگرو باشندے سرکاری عہدوں کے انتخاب میں حصہ لینے سے کلیتہً محروم رہ جاتے تھے ۔ ۱۹۴۴ کے بعد جنوبی ریاستوں میں ابتدائی انتخابات میں ووٹ دینے والے نیگرو باشندوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔

لیکن انتخابات میں نیگرو باشندوں کی شرکت میں جنوبی علاقوں میں ہر جگہ یکساں اضافہ نہیں ہوا ۔ بعض ریاستوں میں نسلی بنیاد پر کسی کے راستے میں ووٹ دینے کے سلسلے میں کوئی خاص رکاوٹ نہیں ہے بعض

[۱] مقدمہ اسمتھ وآل رائٹ ۳۲۱ یو ایس ۶۴۹ (۱۹۴۴)

ریاستوں کے کچھ حصوں میں نیگرو زیادہ تعداد میں ووٹ دینے لگے ہیں لیکن کسی ریاست میں مجموعی طور پر ان کی اوسط میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا مثال کے طور پر جنوبی کیرولینا میں ۱۹۶۰ کے انتخاب میں نیگرو ووٹروں کے ہاتھ میں طاقت کا توازن تھا حالانکہ ریاست کے صرف شہری مرکزوں میں نیگرو ووٹروں کی تعداد زیادہ تھی بعض ریاستوں میں مجموعی طور پر اور بعض کے صرف چند حصوں میں مقامی اور ریاستی انتخابی حکام سے نیگرو باشندوں کو حق رائے دہندگی دیے جانے کی سخت مخالفت کی ہے۔ ریاستی قوانین کا مفہوم بیان کرنے میں بعض حکام نے جو ان قوانین کو نافذ کرتے ہیں نسلی بنیاد پر امتیازی برتاؤ جاری رکھا ہے[۵] لیکن ۱۹۵۷ کے بعد سے قومی حکومت نے ریاستوں میں ووٹ دینے کے قوانین پر منصفانہ طور پر عملدرآمد کرانے کے سلسلے میں زیادہ اہم حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔

نیگرو باشندوں کے رجسٹریشن کے متعلق اعداد و شمار مکمل نہیں ہیں شہری حقوق کے کمیشن کی رپورٹ سے نیگرو ووٹروں کی تعداد میں اضافے کی رفتار کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں مسی سپی میں ووٹ کے بارے میں نسلی عدم مساوات زیادہ پائی جاتی ہے" مسی سپی کے متعلق غیر سرکاری اعداد و شمار سے

---

[۵] لوزیانا کے ووٹ کے قوانین پر عملدرآمد میں اختلاف کے بارے میں جان ایچ فینٹن اور کینیتھ این وائنز کا دلچسپ مضمون "لوزیانا میں نیگرو رجسٹریشن" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ امریکن پولیٹیکل سائنس ریویو ستمبر ۱۹۵۷ء

ظاہر ہوتا ہے کہ اس ریاست میں ووٹ دینے کی عمر کے بالغ نیگرو باشندوں کی ۴ فی صد سے بھی کم تعداد ووٹروں کی حیثیت سے درج رجسٹر ہے اس کے برعکس چھ جنوبی ریاستوں ۔۔ آرکنساس ۔ فلوریڈا ۔ جارجیا ۔ لوزیانا ۔ نارتھ کیرولینا اور ٹیکساس میں ۲۵ فیصد سے زیادہ نیگرو بالغ ووٹر رجسٹرڈ ہیں ۔ فلوریڈا اور ٹیکساس میں اندازاً ۴۰ فی صد نیگرو ووٹروں کے نام درج رجسٹر ہیں[1] ۔ ان دونوں ریاستوں میں سفید فام ووٹروں کی تعداد نیگرو ووٹروں سے کوئی خاص زیادہ نہیں ہے ۔

شہری حقوق کے قوانین

کانگریس نے ۱۹۵۷ اور ۱۹۶۰ میں شہری حقوق کے قانون منظور کیے جن میں صدر اور قومی عدالتوں کو رائے دہندگی کے حق کے منصفانہ نفاذ کے لئے بہت سی ریاستوں میں مداخلت کا اختیار دیا گیا ہے پہلے قانون کے ذریعے امریکہ کا شہری حقوق کا کمیشن قائم کیا گیا جس کے سپرد مختلف قسم کے امتیازات کا جائزہ لینے کا کام تھا اس کے دائرہ عمل میں یہ معلوم کرنا بھی شامل تھا کہ آیا ووٹ کے معاملے میں کسی کے خلاف امتیازی سلوک کیا جاتا ہے

۱؎ سات جنوبی ریاستوں کے سرکاری اعداد و شمار اور تین دوسری ریاستوں کے غیر سرکاری اعداد و شمار شہری حقوق کے امریکی کمیشن کی رپورٹ کی تلخیص "سب کیلئے آزادی اور انصاف" میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔
واشنگٹن ۱۹۶۱

ہے کمیشن سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے بعد صدر اور کانگریس کو رپورٹ پیش کرے۔ اور بتائے کہ اس سلسلے میں مقننہ اور انتظامیہ مزید کیا اقدامات کریں۔ ۱۹۵۷ کے قانون کے ذریعہ محکمۂ انصاف میں شہری حقوق کا ایک شعبہ بھی قائم کیا گیا اور قومی حکومت کے عہدیداروں کو قانون کی ان دفعات کے نفاذ کے لئے عدالتوں کا رُخ کرنے کا اختیار دیا گیا جن میں کسی فرد کے حق رائے دہندگی میں مداخلت کی مناہی کی گئی ہے قانون میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی کہ جو لوگ اس معاملے میں فیڈرل جج کے فیصلے قبول کرنے سے انکار کریں انھیں جرمانہ اور قید کی سزا دی جائے۔

کمیشن کی پہلی رپورٹ میں مقامی افسروں کے کام کی اہمیت پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ ہر علاقے میں نیگرو باشندوں کے ووٹ کے حق کی وسعت کا تعین کرنا ان افسروں کا کام ہے انتخابات کا انتظام اور ووٹروں کا اندراج چونکہ مرکز کی بجائے مقامی حکام کا کام ہے اس لئے کسی ایک ریاست کے اندر بھی مختلف جگہ نیگرو ووٹروں کے خلاف امتیازی برتاؤ میں خاصا فرق ہوسکتا ہے چنانچہ یہ بھی ہوسکتا ہے کسی ریاست کے بعض علاقوں میں نیگرو باشندوں کا کوئی ووٹ نہ ہو اور اس ریاست کے دوسرے حصوں میں دسی نوے فیصد نیگرو ووٹ ڈالے جائیں شہری حقوق کے کمیشن نے اپنی تحقیقات کے بعد سفارش کی کہ نیگرو باشندوں کے حق رائے دہندگی کے منصفانہ

نفاذ کے لئے قومی اختیارات میں توسیع ہونی چاہیئے۔

شہری حقوق کا جو دوسرا قانون ۱۹۶۰ میں منظور کیا گیا اس میں نگرانوں کے تقرر کی اجازت دی گئی اور کہا گیا کہ جن اضلاع میں نیگرو کے حق رائے دہندگی کے خلاف امتیاز برتنے کا الزام ثابت ہو جائے وہاں یہ نگراں نیگرو ووٹروں کا اندراج کرنے کا اختیار رکھیں گے۔ چونکہ پہلے قانون کے تحت کمیشن کو امتیازی سلوک کے بارے میں حقائق معلوم کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے اس دوسرے قانون میں کہا گیا کہ ہر انتخاب کے ۲۲ مہینے بعد تک ناموں کے اندراج اور رائے دہی کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے

۱۹۶۲ میں کانگریس نے دستور میں ایک ترمیم پیش کی جس میں رائے دہی کے لئے پول ٹیکس کی شرط ممنوع قرار دی گئی تھی۔ اس ترمیم کی اصل اہمیت زیادہ تر علامتی نوعیت کی تھی کیونکہ صرف کوئی چھ ریاستوں میں ابھی تک پول ٹیکس رائج تھا۔ پھر سیاسیات کے بیشتر مبصروں کا خیال تھا کہ یہ ٹیکس اب نیگرو کے حق رائے دہندگی کے راستے میں کوئی خاص رکاوٹ نہیں ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ٹکساس میں جہاں ابھی تک پول ٹیکس موجود ہے تقریباً ۰۴ فیصد نیگرو اور اتنے ہی سفید فام ووٹ دیتے ہیں۔ پارٹیوں کا باہمی مقابلہ نہ ہونے کی وجہ سے تمام جنوبی ریاستوں میں دونوں نسلوں کے ووٹروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے وہ اب بھی خاصی اہم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے

کہ جب بیشتر ریاستوں میں پول ٹیکس باقی نہیں رہا تھا تو اسے ختم کرنے کے لئے دستوری ترمیم کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل پول ٹیکس نسلی امتیاز کی علامت تھا اس لئے اسے ختم کرنا ضروری سمجھا گیا۔

شہری حقوق کے دو قوانین کی منظوری، دستوری ترمیم کی تجویز اور نسلی بنیاد پر رائے دہندگی کے معاملے میں امتیازی سلوک ختم کرنے کے لئے دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کی مسلسل جدوجہد کی دو بڑی وجوہ ہیں پہلی یہ کہ امریکی عوام میں بالعموم اور سیاست دانوں میں بالخصوص یہ عام خیال پیدا ہو چکا ہے کہ نسلی امتیاز اخلاقی طور پر غلط ہے اور جمہوری معاشرے میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ شمالی شہری علاقوں میں نسلی اقلیتیں پورے ملک میں مساوی حقوق کے نفاذ کو بڑی اہمیت دیتی ہیں سیاست داں یہ بات بھی جان گئے ہیں کہ شمالی شہری مرکزوں میں ان اقلیتوں کی متحدہ مخالفت کسی صدارتی امیدوار کے انتخاب کو تقریباً ناممکن بنا سکتی ہے چنانچہ دونوں پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے شہری علاقوں سے کانگریس کے امیدوار اصلاحات کے زبردست حامی ہیں خواتین کے حق رائے دہندگی کی طرح اس معاملے میں بھی یہی ہوا ہے کہ بڑی آبادی والی ریاستوں میں ووٹروں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ان علاقوں میں حق رائے دہندگی کے نفاذ کے سلسلے میں

قومی حکومت نے زیادہ عجلت سے کارروائی کی ہے چونکہ نیگرو باشندے بڑی تعداد میں شمالی شہروں کی طرف منتقل ہوتے رہے ہیں اس لئے صدارتی انتخاب میں طاقت کا توازن بدلنے کے سلسلے میں ان کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اس انتخابی خطرے سے اس خیال کو مزید تقویت پہنچی ہے کہ نسل یا عقیدے کا لحاظ رکھے بغیر سب کے لئے سیاسی مساوات کا نفاذ بے حد ضروری ہے۔

امریکہ میں رائے دہندگی کا مستقبل

اب اس بات کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ تمام ریاستوں میں نیگرو باشندوں کو چند سال کے اندر ووٹ کے تمام حقوق حاصل ہوجائیں گے۔ جب وہ دن آئے گا تو حق رائے دہندگی میں مزید توسیع کے لئے کوئی علاقہ باقی نہیں رہے گا سوائے اس کے کہ رائے دہندگی کی عمر گھٹا دی جائے یا ووٹر کے لئے جو معیاری شرطیں ہیں وہ ختم کردی جائیں بہرحال موجودہ ڈھانچے میں تبدیلیوں کی کوششوں کے باوجود ان شرطوں میں کسی قسم کی تبدیلی جلد ہونے کا فی الحال کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

تین کے سوا تمام ریاستوں میں ووٹ دینے کی عمر ۲۱ برس مقرر ہے جارجیا اور کینٹکی میں البتہ ۱۸ سال کے باشندوں کو ووٹ دینے کی اجازت ہے اور الاسکا میں ۱۹ سال کے افراد ووٹ دینے کے اہل سمجھے جاتے ہیں دوسری ریاستوں میں ووٹر کی عمر گھٹانے کی تجویزیں

پیش کی جاتی رہی ہیں اور گاہے گاہے اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ دستور میں ترمیم کر کے تمام ریاستوں میں ووٹروں کی عمر ۱۸ سال کر دی جائے۔ لیکن ابھی تک ان میں سے کسی تحریک کو ٹھوس حمایت حاصل نہیں ہو سکی۔

جنوبی ریاستوں کو چھوڑ کر دوسری بہت سی ریاستوں میں ووٹ دینے کے لئے خواندگی کو معیار مقرر کیا گیا ہے ان میں سے بعض جگہ تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ ووٹر دینا نام لکھ سکتا ہو بعض جگہ معیار زیادہ سخت ہے نیویارک میں ووٹر بننے کے لئے خواندگی کا ایک امتحان پاس کرنا پڑتا ہے جس میں دو ایک پیراگراف پڑھنا اور کچھ ایسے سوالات کے جواب دینا شامل ہے جو عام طور سے چوتھی جماعت کے طالب علم کے معیار کے ہوتے ہیں شمالی ریاستوں میں ۱۸۹۰ء سے ۱۹۲۰ء تک بڑی تعداد میں لوگوں کے آکر آباد ہونے کی وجہ سے خواندگی کی شرط کو عموماً قانونی حیثیت دے دی گئی ان آبادکاروں میں سے بہت سے ایسے تھے جو انگریزی نہ تو پڑھ سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے بعض تو اپنی مادری زبان بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے چونکہ پچھلے چالیس سال میں امریکہ کی بالغ آبادی میں ناخواندگی کا اوسط گھٹ کر صرف ۲ فی صد رہ گیا ہے اس لئے بیشتر شمالی ریاستوں میں خواندگی کا یہ معیار اپنی اہمیت کھو چکا ہے چونکہ موجودہ ناخواندہ امریکیوں میں زیادہ بوڑھے لوگ ہیں اس لئے امید ہے کہ آگے چل کر ناخواندہ لوگوں کی

تعداد اور بھی کم رہ جائے گی۔

موجودہ قوانین کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ غیر ووٹروں کی اوسط میں خواہ مخواہ اضافہ ہو گیا ہے ۱۹۶۰ کے صدارتی انتخاب میں ۲۱ سال سے زیادہ عمر والے باشندوں کے صرف ۶۶/۲ فی صد نے ووٹ دیئے اگرچہ کئی سال سے اتنی بڑی تعداد نے ووٹ نہیں دیئے تھے لیکن اگر اس کا مقابلہ بعض دوسرے جمہوری ملکوں سے کیا جائے تو نتیجہ حوصلہ افزا نہیں نکلے گا۔ بہر حال ووٹ نہ دینے والے ووٹروں کی تعداد میں کمی کی وجوہ آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے چونکہ امریکہ میں ووٹ کے متعلق قوانین ریاستوں میں ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں اس لئے ہر ریاست میں ان کی نوعیت مختلف ہے تمام ریاستوں میں یہ قانون ہے کہ ووٹر بننے کے لئے اس ریاست میں ایک مدت تک رہائش کی شرط ہے لیکن ہر ریاست میں یہ مدت جدا جدا ہے۔ ریاست مین میں ووٹر بننے کے لئے صرف تین مہینے کی رہائش کافی سمجھی جاتی ہے گیارہ ریاستوں میں یہ مدت چھ مہینے ہے اس کے برعکس تین ریاستوں میں دو سال کی رہائش کے بعد ووٹر بننے کا حق ملتا ہے باقی ۳۵ ریاستوں میں ایک سال کی رہائش ضروری سمجھی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی قانون ہے کہ جس گاؤں یا شہر میں کوئی رہتا ہو اسے اس جگہ ووٹر کی حیثیت سے نام درج کرانے سے پہلے کم سے کم ساٹھ یا نوے دن رہائش رکھنی چاہیئے بعض ریاستوں

میں یہ قانون ہے کہ جس ضلع یا علاقے سے ووٹ دینا مقصود ہو وہاں
ووٹ دینے سے پہلے ووٹر کو دس سے تیس دن تک رہائش رکھنی
چاہیئے۔

رہائش کی یہ پابندیاں عموماً اس اندیشے سے لگائی گئی ہیں کہ
لوگ صرف انتخاب میں حصہ لینے کے لئے دوسرے علاقوں سے آکر
دھوکہ دہی کے مرتکب نہ ہونے پائیں پھر ایک ضروری بات یہ ہے
کہ کسی علاقے میں ووٹ دینے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ ووٹر کو وہاں
کے حالات اور امیدواروں کے کوائف سے آگاہی ہو سکے بدقسمتی
سے یہ قاعدے جو مقامی انتخابات کو بدعنوانیوں سے محفوظ رکھنے
کی غرض سے جائز طور پر بنائے گئے ہیں متوقع ووٹروں کو صدارتی
انتخابات میں حصہ لینے سے بھی محروم کرنے کا باعث ہو گئے ہیں حالانکہ
صدارتی انتخاب میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ووٹر مین
میں رہتا ہے یا کیلی فورنیا میں رہائش رکھتا ہے۔

امریکی عوام میں چونکہ نقل و حرکت کا بہت زیادہ رجحان ہے
اس لئے رہائش کی ان شرطوں کی وجہ سے لاکھوں باشندوں کیلئے
بڑی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں ۱۹۶۰ میں اندازاً ۸۰ لاکھ باشندوں
نے نقل مکانی کی جس کی وجہ سے وہ ووٹ دینے کے اہل نہ رہ
سکے کیونکہ نئی جگہ کی ریاستی یا مقامی رہائش کی شرطیں پوری کرنے
سے وہ قاصر رہے۔

۔۔۔ میں غیر حاضر ووٹروں کے ووٹ دینے کی گنجائش موجود ہے لیکن اس سلسلے میں جو قاعدے مقرر ہیں انھیں پورا کرنا اس لئے مشکل ہے کہ ووٹر انتخاب کی تاریخ سے ہفتوں پہلے ووٹ دے اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو ووٹ سے محروم رہے گا یا پھر قانون میں اس امر پہ زور دیا گیا ہے کہ انتخاب کے وقت اس کا ریاست سے باہر ہونا ضروری ہے امریکن (Heritage) فونڈیشن کا اندازہ ہے کہ ۱۹۶۰ میں ۲۵ لاکھ سے زیادہ افراد ووٹ دینے کے نااہل قرار دیئے گئے محض اس وجہ سے کہ وہ انتخاب والے روز سفر پر تھے۔

کوئی ۵۰ لاکھ افراد علالت کی وجہ سے گھروں یا ہسپتالوں وغیرہ میں پڑے تھے اور ووٹ نہیں دے سکے فونڈیشن کے اندازے کے مطابق ۱۹۶۰ کے صدارتی انتخاب میں ایک کروڑ ۵۹ لاکھ ۹۰ ہزار افراد ایسے ریاستی قواعد کی وجہ سے ووٹ دینے سے محروم رہے جو درحقیقت کسی اور مقصد کے لئے بنائے گئے تھے۔

۱۹۶۰ میں کل دس کروڑ چالیس لاکھ امریکی ووٹر تھے اس میں سے اگر ہم ان ایک کروڑ پچانوے لاکھ نوے ہزار افراد کو نکال دیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ووٹ نہیں دے سکے تو باقی آٹھ کروڑ چالیس لاکھ دس ہزار افراد رہ جاتے ہیں جنھیں ووٹ دینا چاہیئے تھا لیکن درحقیقت چھ کروڑ اٹھاسی لاکھ تینتیس ہزار آٹھ سو اٹھارہ افراد

نے ووٹ ڈالے گویا ۱۹۶۰ کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے جتنے
لوگ تمام قانونی شرائط پر پورا اُترتے تھے ان میں سے بھی ۵،۱۸
فی صد نے ووٹ دیئے یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کے خواہشمند حضرات
اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ انتخابات خصوصاً صدارتی انتخا
میں حصہ لینے والوں کے لئے رہائش کی پابندی میں تبدیلی کرنی چاہیئے
ان حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ غیر حاضر ووٹروں کے بارے میں قواعد
بدلنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ مسافروں اور ان لوگوں کو جو کسی وجہ
سے پولنگ اسٹیشن نہیں پہنچ سکتے ووٹ دینے میں آسانیاں فراہم کی
جائیں۔ ریاستیں اگرچہ اپنے قوانین میں تبدیلیاں کر رہی ہیں لیکن ان
کی رفتار کم و بیش سست ہے جن ریاستوں میں قوانین زیادہ سخت
ہیں وہاں تبدیلیوں کی رفتار اور بھی کم ہے۔

---

(۱) بعض ریاستوں میں پہلے ہی یہ قاعدہ بنایا جا چکا ہے کہ صدارتی انتخاب میں
ووٹ دینے کیلئے ساٹھ دن بلکہ بعض جگہ اس سے بھی کم عرصے تک رہائش پذیر
ہونا ضروری ہے کئی دوسری ریاستوں میں یہ قانون ہے کہ خواہ کوئی شخص
ریاست سے باہر چلا گیا ہو جب بھی وہ اپنی سابقہ رہائش کی ریاست سے ووٹ
دے سکتا ہے بشرطیکہ دوسری ریاست میں ابھی وہ باقاعدہ مقیم نہ ہوا ہو۔ یہ
تمام معلومات اور مثالیں برنڈن برن کی کتاب (Lets Modernise
Our Horse and Buggy Election Laws) سے
لی گئی ہیں (واشنگٹن کنکٹی کٹ دی سنٹر فار انفارمیشن آن امریکہ ۱۹۶۱ء)

غیر ووٹر کون ہیں؟

تمام قانونی مسائل کو مدنظر رکھنے کے باوجود امریکہ میں ۱۹۶۰ء میں ایسے ایک کروڑ ۶۰ لاکھ افراد موجود تھے جنہوں نے حق رائے دہندگی استعمال نہیں کیا۔ غیر صدارتی انتخابات میں ایسے لوگوں کی تعداد اور بھی زیادہ ہوتی ہے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو ووٹ دے سکتے تھے لیکن انھوں نے ووٹ نہیں دیا۔

۱۹۶۰ میں حالیہ برسوں کے سابق صدارتی انتخابات کی طرح سب سے کم ووٹ جنوبی ریاستوں میں پڑے مسی سپی کے متوقع ووٹروں میں سے صرف ۲۵٫۶ فی صد نے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا۔ الاباما میں ۳۰٫۹ فیصد جنوبی کیرولینا میں ۳۱٫۵ فی صد اور جارجیا میں ۳۱٫۳ فی صد ووٹ ڈالے گئے جنوب کی دو ریاستوں یعنی ٹینیسی اور شمالی کیرولینا میں ۵۰ فیصد سے کچھ زیادہ ووٹروں نے انتخاب میں حصہ لیا۔ مجموعی طور پر جنوبی ریاستوں میں ۱۹۵۶ء کے انتخاب کے مقابلہ میں ۱۹۶۰ کے صدارتی انتخاب میں کچھ زیادہ ووٹروں نے حصہ لیا ۱۹۵۶ میں بھی سابقہ انتخاب کے مقابلے میں زیادہ ووٹ ڈالے گئے تھے۔

جنوبی ریاستوں میں ووٹروں کی اس حالت کے مقابلہ میں تین شمالی ریاستوں اڈاہو۔ نیو ہمپشائر اور اوٹاہ میں تمام بالغ افراد میں

سے ۸۰ فیصد سے زیادہ ووٹروں نے مسٹر کینیڈی یا مسٹر نکسن کو ووٹ
دیئے دوسری ۲۷ شمالی ریاستوں میں مجموعی بالغ آبادی کے ۷۰ فیصد
نے ووٹ دیئے جنوبی ریاستوں کے علاوہ ہوائی، کنیٹیکی اور میری
لینڈ ہی وہ ریاستیں تھیں جہاں ۶۰ فیصد سے کم لوگوں نے ووٹ
دیئے۔

جنوبی ریاستوں کے باہر زیادہ لوگوں کے ووٹ دینے کی وجہ
ظاہر ہے کیونکہ جنوبی ریاستوں نے اپنے آئین میں اس سلسلے میں جو
پابندیاں درج کر رکھی ہیں وہ بیشتر شمالی ریاستوں کے مقابلہ میں
بہت سخت ہیں جنوبی ریاستوں میں سفید فام اور نیگرو دونوں علاوتاً
ووٹ نہیں دیتے اور اس وجہ سے ان ریاستوں میں اوسط اور کم
ہو جاتا ہے، جنوب کے مقابلے میں شمالی علاقوں کی خواتین بھی انتخابات
میں زیادہ حصہ لیتی ہیں سابق انتخابات کی طرح ۱۹۶۰ میں بھی بعض
جنوبی ریاستوں کے نیگرو باشندوں کو انتخابات میں شرکت سے
روکنے کے لئے جو قانونی اور انتظامی پابندیاں تھیں ان کی وجہ سے
ان لوگوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا پورے ملک میں سب سے
زیادہ ووٹ بڑے بڑے شہروں اور ان کے نواحی علاقوں میں ڈالے
جاتے ہیں کاشتکاروں کو جب تک کاشتکاری سے تعلق رکھنے والے
کسی خاص معاملے پر ووٹ نہ دینے ہوں اس وقت تک وہ سیاسیات
میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتے۔ شہروں میں بھی جو لوگ تھوڑی مدت

پہلے دیہات سے آکر آباد ہوئے ہوتے ہیں وہ حق رائے دہندگی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ شہروں سے باہر جاکر آباد ہونے والے بھی ووٹ دینے سے عموماً احتراز کرتے ہیں۔[1] یہ عجیب بات ہے کہ کسان اگرچہ نسبتاً کم تعداد میں ووٹ دیتے ہیں لیکن انہیں امیدواروں کے متعلق بہت زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔[2]

اگر ہم جنس کے اعتبار سے ووٹروں پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ مرد عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ ووٹ دیتے ہیں اندازاً ۲۰ فیصد مرد ووٹ نہیں دیتے لیکن ووٹ نہ دینے والی عورتیں تقریباً ۳۰ فیصد ہوتی ہیں۔ ۱۹۲۰ میں عورتوں کو رائے دہندگی کا حق ملتے وقت مردوں کے مقابلے میں جتنی تعداد میں عورتیں ووٹ دیتی تھیں اسے دیکھتے ہوئے ان دونوں کے ووٹوں کی اوسط میں اب کم فرق پایا جاتا ہے۔ اب بھی غالباً جنوبی ریاستوں میں بالعموم اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی یہی خیال عام ہے کہ عورت کی جگہ اس کا گھر ہے اور سرکاری نظم ونسق چلانا مردوں کا کام ہے۔ نسبتاً نو عمر ووٹر بھی زیادہ شوق سے ووٹ نہیں دیتے ۲۴ سال سے کم عمر کے ووٹروں کی اندازاً

---

[1] کیمپل کنورس، ملر اینڈ اسٹوکس "امریکن ووٹر"
(نیویارک۔ جان وائلے اینڈ سنز ۱۹۶۰)

[2] وی او کی "رائے عامہ اور امریکی جمہوریت"
نیویارک الفرڈ اے ناف (۱۹۶۱) صفحہ ۴۹۴

۳۰ فیصد تعداد ووٹ نہیں دیتی اس کے مقابلے میں ۳۵ سال سے زیادہ عمر کے ووٹروں میں سے ۲۵ فیصد ایسے ہوتے ہیں جو ووٹ نہیں دیتے۔
ملک کے کم از کم ۹۰ فیصد کالج گریجویٹ ووٹ ضرور دیتے ہیں ہائی اسکول گریجویٹ ووٹروں میں سے تقریباً ۸۰ فیصد ووٹ کا حق استعمال کرتے ہیں اور وہ لوگ جن کی تعلیم گرامر اسکول سے آگے نہیں بڑھی اُن میں سے ۶۰ فیصد سے کچھ زیادہ لوگ ووٹ دیتے ہیں۔
اقتصادی گروپ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں کسی کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا امکان بڑھتا جاتا ہے کہ وہ اپنا ووٹ کا حق ضرور استعمال کرے گا دو ہزار ڈالر سے کم آمدنی والوں میں سے ۵۰ فیصد سے کچھ زیادہ ووٹ دیتے ہیں اور جن کی آمدنی پانچ ہزار ڈالر یا اُس سے زیادہ ہے ان میں سے تقریباً ۹۰ فیصد صدارتی انتخاب میں حصہ لیتے ہیں۔

مختلف پیشوں کے لحاظ سے ووٹ دینے والوں کی اوسط کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ آمدنی والے گروپ کی اوسط سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ پیشہ ورانہ یا انتظامی عہدوں پر فائز لوگوں میں سے تقریباً ۹۰ فی صد ووٹ دیتے ہیں سفید پوش ملازم پیشہ لوگوں کا تقریباً ۸۰ فیصد ووٹ دیتا ہے مزدوروں اور کاریگروں میں سے تقریباً ۷۵ فیصد صدارتی انتخاب میں حصہ لیتے ہیں لیکن غیر کاریگر مزدوروں کا صرف ۶۰ فی صد حصہ ووٹ دیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کسانوں میں بھی ووٹ دینے والوں کی تعداد

خاصی کم ہے گو حالیہ انتخابات میں کوئی ۶۶ فیصد نے ووٹ دیئے ابھی ۱۹۴۸ کی بات ہے کہ انتخاب والے دن آدھے سے زیادہ کسان اپنے گھروں ہی سے نہیں نکلے تھے۔

مخلوط گروپ اور رائے دہندگی

بیرونی ملکوں میں پیدا ہونے والے امریکی باشندے عموماً اپنے ووٹ کا حق بڑی سنجیدگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ان میں سے کم از کم ۸۰ فیصد صدارتی انتخاب میں ضرور حصہ لیتے ہیں ایسے امریکی باشندوں کی دوسری اور تیسری نسل اپنے آبا ؤ اجداد سے بڑھ کر انتخابات میں حصہ لیتی ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ باہر سے آکر آباد ہونے والوں کی چوتھی نسل میں انتخابات سے دلچسپی بہت کم ہوتی نظر آتی ہے اور ان میں سے تقریباً ۷۵ فیصد سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ووٹ کا حق استعمال کرینگے۔

اگر ہم ان امریکی آبادکاروں کے آبائی ملک پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ آئرلینڈ سے آنیوالے کیتھولک عقیدے کے پیرو سب سے زیادہ تعداد میں ووٹ دیتے ہیں ان میں سے تقریباً ۹۵ فیصد افراد حق رائے دہندگی استعمال کرتے ہیں دوسرے لوگ تقریباً ۸۰ فی صد کی تعداد میں ووٹ دیتے ہیں گو اٹلی اور پولینڈ سے آکر آباد ہونے والے دوسرے یورپین ملکوں کے باشندوں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں ووٹ دیتے ہیں۔

حق رائے دہندگی کے عدم استعمال پر عمومی تبصرہ

ووٹ کا حق استعمال نہ کرنے والے مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے مختلف گروپوں میں خاصی مماثلت بھی پائی جاتی ہے کم آمدنی والے گروپ عموماً کم تعلیمیافتہ بھی ہوتے ہیں اسلئے اس بات کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ یہ لوگ غیر کاریگر مزدور اور کاشتکار کی حیثیت سے کام کرتے ہوں پھر نوعمر لوگ بھی نسبتاً کم آمدنی والے گروپوں سے تعلق رکھتے ہیں چونکہ معاشرہ میں ان کی ذمہ داریاں زیادہ نہیں ہوتیں یا پھر وہ اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں اسی لئے ووٹ نہ دینے والوں میں ان لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

رابرٹ لین کا کہنا ہے کہ "شہری علاقوں میں یا ہر سے آکر آباد ہونیوالوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے ان میں مخلوط کیتھولک اور یہودی گروپ شامل ہیں ان میں سے بیشتر میں ووٹ دینے والوں کی تعداد کافی ہوتی ہے اسلئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان گروپوں کی وجہ سے شہری علاقوں میں ووٹ دینے والوں کی اوسط زیادہ ہوتی ہے اور اس زیادہ اوسط کی وجہ ووٹروں کا شہری باشندے ہوتا ہے۵۹"

جن ریاستوں میں شہری آبادی زیادہ ہے وہاں ۱۹۶۰ء میں گزشتہ

---

۵۹ رابرٹ ای لین "سیاسی زندگی" گلینکو الی نائے دی فری پریس ۱۹۵۹ء صفحہ

برسوں کے مقابلے میں زیادہ ووٹ ڈالے گئے اس کے برعکس نسبتاً کم آبادی
والی ریاستوں میں جہاں پروٹسٹنٹ عقیدے کے لوگ زیادہ بستے ووٹ
دینے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ ووٹروں کی اوسط میں سب سے
زیادہ اضافہ شمالی ڈیکوٹا لوزیانا۔ مین اور منے سوٹا میں ہوا۔ لوزیانا
اور منے سوٹا دونوں ریاستوں میں بڑے بڑے شہر موجود ہیں اس کے
علاوہ دیہاتی علاقے بھی بڑے وسیع ہیں۔ دوسری دو ریاستیں زیادہ تر
دیہی علاقوں پر مشتمل ہیں۔

آج ووٹ دینے والوں میں سے سب سے زیادہ اضافہ خواتین میں
نظر آتا ہے اس کے بعد شمالی اور جنوبی دونوں علاقوں کے نیگرو باشندوں
میں ووٹروں کی تعداد زیادہ ہو رہی ہے معمولی تعلیم یافتہ ووٹروں میں
بھی اضافہ نظر آتا ہے بعض شہری علاقوں میں نیگرو ووٹروں کی تعداد سفید
فام ووٹروں کے برابر اور بعض جگہ اس سے بھی زیادہ ہے جہاں تک
یہودیوں کا تعلق ہے ۱۹۳۰ء سے پہلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتخابات
میں حصہ ہی نہیں لے سکیں گے لیکن اب ان کا شمار اس گروپ میں ہے
جو ووٹ دینے کے معاملہ میں سب سے پیش پیش رہتا ہے۔

۳

امریکی ووٹروں کا سیاسی نقطۂ نظر

امریکی رائے دہندوں کی بڑی اکثریت دونوں بڑی سیاسی جماعتوں میں سے کسی ایک سے وابستہ ہوتی ہے۔ ان میں سے بہت سے افراد پیدائشی طور پر ”ری پبلکن یا ڈیموکریٹ ہوتے ہیں۔ اور باقی ماندہ افراد میں سے زیادہ تر اپنے عہد بلوغ کے ابتدائی زمانے ہی میں ان میں سے کسی جماعت کے حامی بن جاتے ہیں۔ کچھ اپنی بعد کی زندگی میں اپنی جماعتی وابستگی کو بدل دیتے ہیں۔ جو لوگ بعد میں جماعتی تعلق میں تبدیلی کرتے ہیں عام طور پر وہ ڈیموکریٹک جماعت کو چھوڑ کر ری پبلکن جماعت میں آجاتے ہیں۔

رجسٹریشن کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ رائے دہندگان جو جماعتی ترجیح کا اظہار کرتے ہیں وہ ڈیموکریٹک جماعت کو ترجیح دیتے ہیں اور ترجیح میں ۳ اور ۴ کا تناسب ہوتا ہے (یعنی ۳ ری پبلکن کے مقابلے میں ۴ ڈیموکریٹ۔ یہ اعداد و شمار نامکمل ہیں اور رائے دہندوں کی مجموعی تعداد کے ۶۰ فیصد سے زیادہ افراد کا احاطہ نہیں کرتے بعض ریاستوں میں رجسٹریشن تو ہوتا ہے لیکن جماعتی وابستگی کے اعلان کی کوئی شرط نہیں ہوتی کچھ ریاستیں ابتدائی انتخابات میں حصہ لینے والوں سے جماعتی ترجیح کے اظہار کی توقع کرتی ہیں۔ لیکن وہ یہ اجازت بھی دیتی ہیں کہ رائے دہندہ

اس امر کا اعلان نہ کرے کہ وہ کس جماعت کا حامی ہے۔ کچھ ریاستوں میں شہریوں کے محض ایک حصّہ کا رجسٹریشن کافی سمجھا جاتا ہے اور بعض ریاستوں میں رجسٹریشن کے ریاست وار اعداد و شمار ہی نہیں ہیں اگرچہ وہاں ابتدائی انتخابات سے پہلے جماعتی ترجیح کا اظہار کیا جاتا ہے ــــ مجموعی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ رجسٹریشن کے اعداد و شمار اس اعتبار سے کسی حد تک غیر مستقیم اور گمراہ کن ہوتے ہیں کہ کسی خاص ریاست میں کسی جماعت کے غلبہ کی وجہ سے زیادہ تر ووٹر اپنے آپ کو غالب جماعت کے ارکان کے طور پر رجسٹر کراتے ہیں تاکہ وہ ایسے امیدوار کی نامزدگی میں شریک ہو سکیں جس کی کامیابی عام انتخاب میں بڑی حد تک یقینی ہو۔ غالب جماعت کے لئے اپنی ترجیح کے اظہار کے باوجود بہت سے ووٹر عام انتخابات میں اقلیتی جماعت کے امیدواروں کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال جنوب میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جہاں کم و بیش ہر شخص اپنے آپ کو ڈیموکریٹ کی حیثیت سے رجسٹرڈ کراتا ہے، لیکن اس کے باوجود جنوب کے کتنے ہی فیصد ووٹ ۱۹۲۸ء کے بعد سے صدر اور نائب صدر کے انتخابات میں ری پبلکن امیدواروں کے حق میں ڈالے گئے ہیں۔

خوش قسمتی سے رجسٹریشن کے اعداد و شمار وہ واحد ذریعہ نہیں ہیں، جسے ہم ووٹروں کی جماعتی وابستگی کی شہادت قرار دے سکیں رائے عامہ کے ایسے جائزے بھی کرائے گئے ہیں جن میں ووٹروں اور امکانی ووٹروں سے ان کی جماعتی وابستگی کے بارے میں معلوم کیا

گیا ہے مشیگن کے تحقیقاتی جائزہ کے مرکز Michigan Survey) Research Center) کے نتائج کے مطابق ۴۷ فیصد رائے دہندگان اپنے آپ کو "مضبوط" یا "کمزور" ڈیموکریٹ سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس ۲۱ سال سے زیادہ عمر کے ۲۷ فیصد شہری اپنے آپ کو "مضبوط" یا "کمزور" ری پبلکن تصور کرتے ہیں۔ باقی شہری اپنے آپ کو آزاد قرار دیتے ہیں لیکن ان نام نہاد آزاد ووٹروں میں بھی آپ سے لے کر دو تہائی تک دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کی طرف ذہنی جھکاؤ محسوس کرتے ہیں۔ اس گروہ میں بھی جو اپنے آپ کو آزاد کہتا ہے، ڈیموکریٹ ارکان کو فوقیت اور بالا دستی حاصل ہے، اگرچہ یہاں یہ فوقیت ترجیح کے اظہار کرنے والے ووٹروں کے مقابل محدود اور کم تر ہے[۱]

مرکزی مغربی ریاستیں

ڈیموکریٹک	۵۱ فیصد
ری پبلکن	۴۰ فیصد
مذبذب	۹ فیصد

---

[۱] امریکی ووٹر (مطبوعہ سنہ ۱۹۶۰ء) از کیمپبل، کنورس، ملر اور اسٹوکز صفحہ ۱۲۴۔

ایسے ہی اعداد و شمار رائے عامہ کے امریکی تحقیقاتی ادارہ نے بھی سنہ ۱۹۶۱ء میں دیئے تھے جب لوگوں سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ کس جماعت کے ساتھ اپنے کو رجسٹر کرائیں گے۔ جنوب میں ۶۷ فیصد نے اپنے آپ کو ڈیموکریٹ اور ۲۴ فیصد نے ری پبلکن کہا۔ ۹ فیصد کا کوئی انتخاب نہ تھا۔ باقی علاقوں کے بارے میں ادارہ کے اعداد و شمار متن میں دیکھئے۔

مغرب بعید (کی ریاستیں)

ڈیموکریٹک	۵۶ فیصد
ری پبلکن	۳۵ فیصد
مذبذب	۹ فیصد

مشرق (کی ریاستیں)

ڈیموکریٹک	۵۰ فیصد
ری پبلکن	۴۳ فیصد
مذبذب	۷ فیصد

جائزہ کے تحقیقاتی مرکز نے اس بات پر بحث کی ہے کہ کسی خصوص انتخاب میں لوگوں کے ووٹوں کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی جماعتی وابستگی کو جاننا نہایت ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ووٹر ہر انتخاب میں اپنی سیاسی ترجیح پر دوبارہ غور نہیں کرتا یعنی وہ اسی جماعت کو ووٹ دیتا ہے جس کے ساتھ اس کی وابستگی معروف ہوتی ہے بشرطیکہ کوئی غیر معمولی صورت حال اسے جماعتی وفاداری سے دست بردار ہونے کا سبب بن جائے۔ اس طرح کسی مخصوص انتخاب میں رجسٹر شدہ افراد اور دوستوں کی اکثریت سے جماعت کی کامیابی کی شرط بدلی جا سکتی ہے۔ مسائل اور امیدوار کبھی کبھی فیصلہ کن عنصر ثابت ہو سکتے ہیں لیکن عام طور پر ووٹروں کی جماعتی وابستگی ہی پر انتخابی نتائج کا دارو مدار ہوتا ہے۔

جائزہ کے تحقیقاتی مرکز نے بتایا ہے کہ امریکہ کے رائے دہندگان چھوٹے چھوٹے معاشی اتار چڑھاؤ اور بیشتر خارجی (پالیسی کے) بحرانوں کے درمیان اپنی جماعت سے وابستہ رہتے ہیں۔ ان کی اصطلاح میں بیشتر انتخابات "برقرار رہنے والے انتخابات" ہوتے ہیں۔ یہ اصطلاح ان انتخابی مقابلوں کی وضاحت کرتی ہے جن میں شہری اپنی سیاسی وابستگی کو ووٹ دیتے ہیں اور اس طرح اس جماعت کو اقتدار میں "برقرار" رکھتے ہیں جو کسی نہ کسی رو سے عوام کی اکثریت کی وابستگی حاصل کر لیتی ہے۔ عوام کے ڈیموکریٹک رجحانات کی وجہ سے ۱۹۳۲ء سے اب تک زیادہ تر انتخابات میں ڈیموکریٹک جماعت کو اکثریت اور فتح حاصل ہوئی ہے۔

دوسری قسم کے انتخابات انحرافی انتخابات" (Deviating Elections) کہلاتے ہیں۔ ان انتخابات میں رائے دہندوں کی جماعتی ترجیح اور پسند میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن اقلیتی جماعت کے کسی امیدوار کی (غیر معمولی) مقبولیت کی وجہ سے یا زیادہ سنگین نوعیت کے کسی اہم مگر عارضی مسئلہ کی وجہ سے رائے دہندگان اپنی ترجیحی جماعت کا ساتھ چھوڑ کر حزب اختلاف کے امیدوار کو چن لیتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۶ء کے انتخابات جنہوں نے جنرل آئزن ہاور کو وائٹ ہاؤس میں پہنچا دیا تھا، اسی نوعیت کے انتخاب تھے۔ ان دونوں انتخابات میں ووٹروں کی جماعتی وابستگی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ رائے دہندگان کی بڑی اکثریت نے آئزن ہاور کے حق میں رائے دی لیکن یہ

اکثریت ڈیموکریٹک جماعت ہی کو پسند کرتی رہی۔ اس اکثریت نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک چار انتخابات میں سے تین میں ڈیموکریٹک جماعت کو اس وقت بھی کانگریس کے دونوں ایوانوں میں واضح اور فیصلہ کن فتح عطا کی، جب کہ ری پبلکن صدر منتخب کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں آئزن ہاور کی شخصیت کی کشش نے ووٹروں کو اپنے روایتی جماعتی رشتے سے انحراف پر آمادہ کر دیا۔ مگر صرف آئزن ہاور کو ووٹ دینے کی حد تک آئزن ہاور کے جماعتی رفقاء کو ان رائے دہندگان کی حمایت حاصل نہ ہو سکی۔

ایک ایسی ہی صورت حال ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئی تھی جب وڈرو ولسن (Woodrow Wilson) دوبارہ صدر منتخب ہوئے تھے۔ پہلی بار وہ ۱۹۱۲ء میں منتخب ہوئے تھے اور یوں ری پبلکن جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ وہ چار سال کے بعد دوبارہ صدر چنے گئے۔ حالانکہ اس بات کی پوری شہادت موجود تھی کہ ملک ری پبلکن نقطۂ نظر کا حامی تھا۔ قوم نے اس عہد کی تمام اور نارمل رائے دہی کا نمونہ ۱۹۱۸ء میں پیش کیا جب ایک ری پبلکن کانگریس چنی گئی اور ۱۹۲۰ء میں ری پبلکن جماعت نے حکومت کے تینوں انتخابی شعبوں پر مکمل قابو اور کنٹرول حاصل کر لیا۔

جائزہ کے تحقیقاتی مرکز کی تحقیقات کے مطابق انتخابات کی تیسری قسم ہے "نئی وفاداریوں یا نئی جماعتی صف بندی کا انتخاب" (Realigning Election) ایسے انتخابات شاذ و نادر ہوتے

ہیں اور نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ رائے دہندگان اپنی جماعتی وابستگی کی بندش کو ڈھیلا کر دیتے ہیں اور کم و بیش مستقل طور پر دوسری بڑی جماعت، یا کسی نئی یا تیسری جماعت سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سیاسی زلزلہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ نئی وفاداریوں کے انتخابات میں، نئے رائے دہندگان اور ماضی میں جماعتی تعلق سے بے نیاز رہنے والے شہری، سیاسی مرحلوں میں الجھ جاتے ہیں اور نئی اور بہتر جماعت کے حامی بن جاتے ہیں۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں امریکی خانہ جنگی کے آغاز میں لنکن کا انتخاب اس نوعیت کے اہم ترین اور عظیم ترین انتخابات میں سے تھا۔ اس انتخاب نے ری پبلکن جماعت کو جو اکثریت عطا کی وہ کم و بیش پچھتر سال تک قائم رہی۔ کلیولینڈ (Clevelandا) اور ولسن کی فتح کو انحرافی فتح قرار دیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس وقت یہ قومی ری پبلکن اکثریت تخلیق ہو رہی تھی، اسی زمانہ میں جنوب میں مستقل اور ٹھوس ڈیموکریٹک اکثریت تھی۔ وہ اکثریت جو ایک صدی کے بعد آج بھی بیشتر انتخابات میں موجود ہے۔ خانہ جنگی کے بعد کم از کم اڑسٹھ سال تک جنوب نے ہی ڈیموکریٹک جماعت کو وہ انتخابی قوت بخشی جس نے اس سیاسی جماعت کو ملک کی ایک عظیم جماعت کی حیثیت سے زندہ رکھا۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں موجودہ زمانہ میں نئی وفاداریوں کا دوسرا انتخاب ہوا۔ اس سال سنگین دباؤ اور انتشار کے تحت عوامی حمایت بڑے

پیمانہ پر ڈیموکریٹک جماعت کی طرف منتقل ہو گئی جیسے فرینکلن ڈی۔
روزویلٹ کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے بعد سے اب تک ووٹروں
کی ایک اکثریت اسی جماعت کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ ۱۹۳۲ء اور
۱۹۶۲ء کے درمیان صرف دو بار ریپبلکن جماعت نے کانگریس کے
دونوں ایوانوں میں اقتدار حاصل کیا ہے۔ ہر مرتبہ برائے نام اکثریت
سے، اور صرف دو سال کی مدت کے لئے۔ اور صرف ایک بار ہی ریپبلکن
وائٹ ہاؤس کو اپنا سکے۔ جب آئزن ہاور ان کے امیدوار تھے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئی جماعتی وابستگی یا صف بندی ملک کے
کسی ایک حصہ میں جنم لے سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ محض ایک قسم کے
انتخاب کے لئے۔ یہ بحث معقول معلوم ہوتی ہے کہ شمال مشرق کے شہروں
میں ۱۹۲۸ء میں نئی جماعتی وفاداریاں وجود میں آئی ہوں گی۔ قوم کے
رائے دہندگان کی وفاداریوں میں عام اور بڑے پیمانے پر نئی وفاداریوں
کی تخلیق سے چار سال پہلے۔ جے۔ جے۔ ہتھمیکر T. J. Huthmachen
کے خیال کے مطابق الفریڈ ای۔ اسمتھ Alfred E. Smith
کی امیدواری نے منتقلین کے بعض گروہوں کو قریب تر لانے میں بڑا حصہ
لیا۔ آئرلینڈ اور اطالیہ کے منتقلین کے گروہ، جو پہلے اپنی سیاسی وابستگی
میں ایک دوسرے سے الگ اور دور رہتے تھے، وہ ایک دوسرے سے قریب
آ گئے۔ یہ مطالعہ (Massachusetts) کی دولت مشترکہ تک محدود
ہے، لیکن ایسی ہی تبدیلیاں شمالی مشرقی ریاستوں کے شہری علاقوں

میں دوسرے مقامات میں بھی رونما ہوئیں۔

جنوب میں ۱۹۴۸ء میں ایک ایسی ہی امکانی علاقائی نئی وابستگی کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اور اگر اس مثال کو تسلیم کر لیا جائے تو اسے ایک مختلف قسم کی نئی وابستگی اور وفاداری قرار دیا جائے گا۔ ۱۹۴۸ء میں ڈیموکریٹک جماعت نے اپنے قومی اجتماع میں ایک منشور منظور کیا جس میں تمام نسلوں کے افراد کے لئے سیاسی اور معاشی مساوات کا عہد کیا گیا۔ جنوبی وفود کے شدید احتجاج کے باوجود یہ منشور منظور کر لیا گیا۔ جنوب کے کچھ مندوبین نے اجتماع کا مقاطعہ بھی کیا۔ اس سال کے موسم خزاں کے عام انتخابات میں چار ریاستیں ڈیموکریٹک جماعت سے ٹوٹ گئیں اور انھوں نے ریاستی حقوق کی جماعت (States Rights Party) یا ڈکسی کریٹ جماعت کا ساتھ دیا جو نسلی امتیاز و تفریق کے حق میں تھی۔ ۱۹۴۸ء سے اب تک جنوبی ریاستوں نے مکمل طور پر صدارتی انتخاب میں ڈیموکریٹک جماعت کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار گزشتہ چار انتخابات میں گیارہ سابق عہدیہ ریاستوں میں سے کم از کم چار ریاستوں کی حمایت سے محروم رہے ہیں (مزید برآں ری پبلکن جماعت کو اس پورے علاقہ میں گزشتہ تین انتخابات میں پچاس فی صد یا اس سے

٭ سابق عہدیہ (Confederate) ریاستیں۔ وہ گیارہ ریاستیں جو ۱۸۶۱ء-۶۱ء کی خانہ جنگی میں امریکی یونین سے علٰحدہ ہو گئی تھیں۔ مترجم

بھی کچھ زیادہ ووٹ ملے ہیں۔ اگر ۱۹۴۸ء میں ریاستی حقوق کی جماعت اور ری پبلکن جماعت کے ووٹ یک جا کر لئے جاتے، تو یہ بات اُس سال کے (انتخابات کے) لئے بھی درست ہو سکتی تھی۔ ۱۹۶۰ء میں ری پبلکن صدارتی امیدوار رچرڈ ایم نکسن کو جنوب میں اکثریتی جماعتوں کے ووٹوں کے ۴۷ فیصد ووٹوں سے زیادہ ملے۔

ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار جان ایف۔ کنیڈی کو مجموعی ووٹوں میں سے ۵۰.۵ فیصد ووٹ ملے۔ اگر یہ صورت حال جنوب میں جاری رہے گی تو ۱۹۴۸ء کے انتخابات کو اس علاقہ میں صدارتی انتخاب کی حد تک نئی سیاسی وابستگی اور وفاداری کے انتخابات قرار دینا پڑے گا۔

یہ بات مکمل طور پر واضح ہے کہ جنوب میں کوئی عام سیاسی جدید صف بندی نہیں ہوئی ہے۔ کانگریس کی رکنیت اور ریاستی و مقامی عہدوں کے لئے ڈیموکریٹک جماعت سے جنوب والوں کی روایتی وابستگی بلکہ جانثاری میں کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جس مدت میں ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار کے خلاف آراء کی تعداد بڑھتی رہی ہے، اس میں ورجینیا، فلوریڈا، ٹینیسی (Tennessee) اور ٹیکساس میں ری پبلکنوں کو کانگریس کی برائے نام نشستیں حاصل ہوئی ہیں اور جنوب میں کانگریس کے انتخابی اضلاع میں سو میں کم از کم نوّے انتخابی اضلاع میں ڈیموکریٹک جماعت کو فتح اور فوقیت حاصل رہی ہے۔ ری پبلکنوں نے ۱۹۶۱ء میں ٹیکساس میں سینٹ کی ایک نشست

جیت لی اور یوں تعمیر نو کے عہد کے بعد پہلی مرتبہ جنوب کا کوئی ری پبلکن سینٹ میں پہنچا۔ تعمیر نو کا عہد خانہ جنگی کے بعد شروع ہوا تھا۔

ڈیموکریٹک جماعت کے ساتھ جنوب کے ووٹروں کے اس طرز عمل سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ جماعت کے صدارتی اور کانگریس سے متعلق بازوؤں کی تقسیم کو کس حد تک سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ صدارتی بازو جو شمال کے شہری ووٹوں پر تکیہ رکھتا ہے، شہری حقوق کی قانون سازی کی حمایت کرے گا۔ اور غالباً ان دوسرے قوانین کی بھی حمایت کرے گا جس کی مخالفت جنوب کی شہری آبادی کے متوسط طبقہ کی اکثریت (ضرور) کرے گی۔ دوسری طرف وہ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ جنوب سے کانگریس کے جو ڈیموکریٹک ارکان منتخب ہوں گے وہ یا تو شہری حقوق کے مخالف رجحانات کی نمائندگی کریں گے یا جماعت کے صدارتی گروہ کی نسبت شہری حقوق کے بارے میں ان کا موقف کمزور ہوگا اور اس میں شدت نہ ہوگی۔ اور ایک ضمنی مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء میں ری پبلکن صدارتی امیدوار کو جنوب کے بڑے شہروں میں ملک کے باقی حصوں کے بڑے شہروں اور ریاستی مرکزوں کی نسبت کہیں زیادہ ووٹ ملے۔

ڈیموکریٹ کسے کہتے ہیں؟

یہ کہنا ناممکن ہے کہ لوگوں کا یہ یا وہ گروہ، فلاں سیاسی جماعت

سے تعلق رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر کوئی بڑا گروہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں میں سے کسی کا حامی نہیں ہوتا، لیکن بعض گروہوں کے ارکان کی اکثریت ڈیموکریٹ یا ری پبلکن ہو سکتی ہے۔ جنوب اس بحث کے سلسلہ میں ایک اہم اور خاص مسئلہ پیدا کر دیتا ہے کیونکہ جیسا ہم ابھی مطالعہ کر چکے ہیں، صدارتی انتخاب کے علاوہ دوسرے تمام انتخابات میں ہر گروہ کے جنوبی باشندے ڈیموکریٹک جماعت کی زبردست اور بے پناہ حمایت کرتے ہیں۔ شمال میں، جہاں بیشتر ریاستیں ہیں، دونوں سیاسی جماعتیں، کم و بیش مساویانہ حیثیت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی ہیں، ووٹروں کی تقسیم قطعی مختلف ہے۔ اسی لئے جماعتی رکنیت کی بحث جو سطور ذیل میں پیش کی جا رہی ہے، بنیادی طور پر شمال کے رائے دہندگان سے تعلق رکھتی ہے۔

۱۹۳۲ء سے شمالی مشرق اور وسطی مغرب کے بڑے شہری مرکزوں میں سے بیشتر مضبوط ڈیموکریٹک گڑھ اور قلعوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں بعض شہروں نے تو ۱۹۲۸ء میں بھی ڈیموکریٹک جماعت کی حمایت کی تھی۔ شہروں میں مزدور اور بعض اقلیتیں مثلاً نیگرو، یہودی اور رومن کیتھولک، ڈیموکریٹک حامیوں میں ممتاز اور مضبوط رہی ہیں۔ تخمیناً شہری مزدوروں اور کام کرنیوالوں میں سے ۶۵ فیصد ڈیموکریٹ ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ایک سرسری اندازے کے مطابق اسی فیصد یہودیوں، اور اسی قدر کیتھولک اور نیگرو باشندوں

سے ڈیموکریٹک امیدواروں کے حق میں ووٹ ڈالے۔ یہودی ووٹوں کی یہ تعداد (فیصد کے اعتبار سے) گزشتہ تیس سال کے انتخابات کے مقابلے میں کچھ ہی زیادہ تھی[۵۲] (یعنی یہودیوں کی اکثریت ہمیشہ سے ڈیموکریٹوں کے ساتھ رہی ہے)۔

کیتھولک ووٹ جو کئی برس سے ڈیموکریٹک جماعت کو ساتھ تھے ۱۹۴۸ء میں آہستگی کے ساتھ ری پبلکن جماعت کی طرف منتقل ہونے شروع ہو گئے اور ۱۹۵۶ء تک یہ ووٹ دونوں جماعتوں کے درمیان تقریباً مساوی طور پر تقسیم ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں سینیٹر کینیڈی کو کیتھولک ووٹ ۸ اور ۲ کے تناسب سے ملے (۸۰ فیصد)۔ ملک کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت شمال مشرق اور جنوب میں زیادہ کیتھولک ووٹ ڈیموکریٹک جماعت کو ملے[۵۳]

---

[۵۲] یہودی بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک کم تعداد میں انتخابات میں حصہ لیتے تھے۔ سیاست میں ان کی دلچسپی اور شرکت نازی خطرہ کے دوران بڑھی۔ انھوں نے قوت کے ساتھ فرینکلن روزویلٹ اور ڈیموکریٹک جماعت کا ساتھ دیا، کیونکہ صدر نازیت کے خلاف اور شہری حقوق کے علمبردار تھے۔

[۵۳] کیتھولک ووٹوں کی یہ منتقلی پروٹسٹنٹ نائب صدر نکسن کے لئے خاص طور پر نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ اس سے پہلے کیتھولک ان کے سب سے پرجوش حامی تھے۔ نیویارک میں ۱۹۶۰ء کے آغاز کی ایک رائے شماری کے مطابق نکسن کو سینیٹر کینیڈی کے علاوہ تمام دوسرے (امکانی) ڈیموکریٹ امیدواروں سے زیادہ کیتھولک ووٹ ملتے۔

خانہ جنگی سے ۱۹۳۲ء تک نیگرو ووٹ بڑی حد تک ری پبلکن ووٹ رہا ہے۔ سرد بازاری کے تسلط اور فرینکلن روز ویلٹ کے نظام نو کی آمد آمد کے ساتھ نیگرو ووٹ کا رُخ بدل گیا اور نیگرو رائے عامہ ڈیموکریٹک ہو گئی۔ اُس وقت سے اب تک امریکی حبشی ڈیموکریٹک رہے ہیں۔ گیلپ رائے شماری (Gallup Poll) کے مطابق صدر آئزن ہاور کی شخصی مقبولیت نے ۳۹ فیصد نیگرو ووٹ حاصل کر لئے۔ ۱۹۵۲ء میں انہیں جو نیگرو حمایت حاصل ہوئی تھی، اس میں ۱۸ فیصد اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ اس انتخاب نے ری پبلکن امیدوار کو کئی بڑے شہروں میں نیگرو حلقہ کو اپنانے کا موقع دیا۔ بعض جنوبی شہروں میں جہاں نیگرو باشندوں نے مقامی ڈیموکریٹک رہنماؤں اور قیادت کو نسلی امتیاز و تفریق کے ساتھ وابستہ کر دیا، آئزن ہاور نے خاص طور پر کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں شمال اور جنوب میں زیادہ تر نیگرو رائے دہندگان دوبارہ ڈیموکریٹک جماعت کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ گیلپ رائے شماری کے اندازہ کے مطابق کینیڈی کو ۶۸ فیصد نیگرو ووٹ ملے۔

بعض تخمینوں کے مطابق اس سے بھی زیادہ نیگرو ووٹ کینیڈی کے حق میں ڈالے گئے۔ گیارہ بڑے شہروں کے سب سے زیادہ نیگرو اکثریت کے علاقوں میں ڈیموکریٹک جماعت کے حق میں نیگرو ووٹوں میں ۱۹۵۶ء کے مقابلہ میں ۸ سے ۲۶ فیصد تک کا اضافہ ہوا۔ کثیر نیگرو آبادی کے شہروں میں سے صرف اٹلانٹا (Atlanta) میں ری پبلکنوں

کو کامیابی حاصل ہوئی۔

مزدوروں کے ووٹ بھی سنہ ۱۹[illegible]ء میں ری پبلکن جماعت سے منحرف ہو گئے لیکن کیتھولک اور نیگرو ووٹوں کی طرح نہایت ڈرامائی انداز میں نہیں۔ کساد بازاری کے دور میں تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ مزدوروں کے ووٹوں کی بڑی اکثریت کو ڈیموکریٹ ارکان نے جیت لیا تھا۔ روزویلٹ کے انقلابی تنظیمی مقاصد کے لئے یونینوں کی مدد کرکے اور بے روزگاری کو دور کرنے کی غرض سے سرکاری ملازمتیں پیش کرکے مزدوروں کی وابستگی کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا تھا۔ ان عناصر نے مزدوروں کے ووٹوں میں ڈیموکریٹک تناسب میں اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن جیسا کہ دوسرے تمام گروہوں کی طرح آئزن ہاور نے مزدوروں کے درمیان بھی ڈیموکریٹک ووٹوں کی تعداد اور تناسب کو اپنی ذاتی مقبولیت کی وجہ سے کم کر دیا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے مزدوروں کے ۳۹ فیصد ووٹ حاصل کئے اور ۱۹۵۶ء میں ۴۳ فیصد کامگاروں اور محنت کشوں نے اُن کی حمایت کی۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں مزدوروں کے ری پبلکن ووٹوں کی تعداد فی صد میں تخفیف ہوئی اور یہ تعداد گھٹ کر ۳۵ فی صد ہو گئی۔

یہ کہنا شاید غیر ضروری ہے کہ اوپر جن گروہوں کا ذکر کیا گیا، اس میں تکرار ہے۔ شہری محنت کشوں کی تعداد کا ایک بڑا حصہ کیتھولک، نیگرو اور یہودیوں پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں طبقاتی، مذہبی یا نسلی پس منظر

نے ڈیموکریٹک جماعت کے حق میں شہری آبادی کے ووٹوں کو ہموار کرنے میں ایک دوسرے کو تقویت پہنچائی۔

ری پبلکن کسے کہتے ہیں؟

ری پبلکن رائے دہندگان سب سے بڑی تعداد میں تاجر طبقوں کی برادری میں ملیں گے — خواہ وہ تاجر چھوٹے ہوں یا بڑے۔ پیشہ ور افراد، خاص طور پر آمدنی کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے، اکثر ری پبلکن ہوتے ہیں۔ جنوبی ریاستوں سے باہر کسان، عام طور پر ری پبلکن ووٹروں کی فہرست میں نظر آتے ہیں، اگرچہ وہ اب اس جماعت سے اس قدر قوی اور گہرا تعلق نہیں رکھتے جتنا کساد بازاری سے پہلے رکھتے تھے۔ مثلاً ۱۹۵۲ء میں کاشتکاروں کے ووٹ (Votes) بڑی تعداد میں ری پبلکن جماعت کو ملے اور اس حقیقت کے باوجود کہ کاشتکاری اور فارم کی آمدنی (کوریائی جنگ کی ایک مختصر سی مدت کے استثنیٰ کے ساتھ) میں وہ گراوٹ اور رکود جاری رہی جس کا آغاز ایک دہائی سے کچھ پہلے ہوا تھا۔

نسلی گروہوں میں ری پبلکنوں کو سب سے زیادہ حمایت ان افراد کی حاصل ہے جو نسلی طور پر اسکنڈے نیویا؎ اور جرمنی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخر الذکر بڑی تعداد میں یہاں پہلی بار ۱۸۴۸ء کے ناکام

؎ تین ملکوں یعنی ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کے مشترکہ نام ہیں۔ مترجم

انقلاب کے بعد آئے۔ ان میں سے بہت سے یونین کی فوجوں کی طرف سے غلام ریاستوں کے خلاف لڑے اور انھوں نے ۱۸۶۰ء میں منتقل ہونے والی ری پبلکن جماعت کی امداد کی۔ ری پبلکن جماعت کے ساتھ ان کی وابستگی کو اس حقیقت نے بھی اور مستحکم کر دیا ہے کہ دونوں عالمی جنگوں میں جب امریکی سپاہی جرمن سپاہیوں کے خلاف نبرد آزما تھا تو وائٹ ہاؤس میں ڈیموکریٹ صدر ہی متمکن تھے۔

پروٹسٹنٹ ووٹ کا جھکاؤ عام طور پر ری پبلکنوں کی طرف ہی ہوتا ہے۔ (بعض) جائزوں کے مطابق ری پبلکن عام حالات میں ۶۲ فیصد پروٹسٹنٹ ووٹوں کی توقع کر سکتے ہیں مگر ۱۹۶۰ء میں اس میں صرف ایک فیصد کا اضافہ ہوا۔ ڈیموکریٹوں کے لئے کیتھولک رائے دہندوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا، اس کی نسبت سے پروٹسٹنٹ ووٹ ری پبلکن جماعت کی حمایت میں نہیں بڑھے۔ پروٹسٹنٹ ووٹوں کی تبدیلی اور ان کا منتقلی جنوب میں اوکلاہاما (   ) کنٹکی اور میسوری (   ) کی سرحدی ریاستوں میں سب سے زیادہ اہم تھی۔ مغرب وسطیٰ کی بعض ریاستوں میں بھی پروٹسٹنٹ رائے دہندگی میں (تعداد کی) اضافہ ہوا۔ اس کے برخلاف شمال مشرق میں ڈیموکریٹک جماعت کو اپنے سابقہ حصہ سے کہیں زیادہ پروٹسٹنٹ ووٹ مل گئے۔

دونوں بڑی سیاسی جماعتیں ان گروہوں کے افراد کی کسی قدر

حمایت پر تکیہ کر سکتی ہیں جو مخالف جماعت کے ساتھ شدت سے وابستہ ہیں۔
ری پبلکن مزدوروں کے تخمیناً ۳۵ فیصد ووٹ حاصل کرنے کی توقع رکھ
سکتے ہیں۔ ڈیموکریٹ تاجروں اور پیشہ ور کارکنوں کے اسی قدر ووٹوں
کے حصول کی امید کر سکتے ہیں۔

ہر جماعت جس قسم کی حمایت حاصل کرتی ہے، وہ ان جماعتوں
کے ترجمانوں کے نظریہ اور نقطہ نظر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دونوں
جماعتوں کے رہنما اعتدال پسند ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان دونوں کو برقرار
رکھنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت کو اپنی حمایت کے خاص مرکزوں اور
ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں اور ان ہمدردوں اور حامیوں کو بھی کھونا نہیں
چاہتے جو مخالف جماعت کی صفوں سے مل سکتے ہیں۔ ری پبلکن مزدوروں
کے ووٹوں کے اس حصہ کو کھونا نہیں چاہتے جو انہیں اب بھی مل جاتے
ہیں اور ڈیموکریٹ متوسط طبقہ اور زیادہ آمدنی رکھنے والے ان ووٹوں
سے دست بردار نہیں ہونا چاہتے جو ان کے ساتھ ہیں۔

اس بات کی بھی کچھ شہادت موجود ہے کہ دونوں جماعتوں میں
سے چھوٹی جماعت کے لئے بڑی جماعت کی نسبت سے انتخاب میں اپنے
رائے دہندگان کی حمایت برقرار رکھنے کے زیادہ امکانات ہیں جس
کا مطلب یہ ہے کہ ری پبلکن غلبہ کے پچھتر برسوں میں ایک سخت گروہ
کی طرح ڈیموکریٹک جماعت باقی رہی۔ (ایک مضبوط حزب اختلاف)
اسی طرح ایک مضبوط ری پبلکن جمعیت عام طور پر فتح پانے والی ڈیموکریٹک

جماعت کی طرف کھینچنے کی ہر ترغیب کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس کے برعکس اکثریتی جماعت کے ووٹر خاصی تعداد میں کبھی کبھی حزب اختلاف کے افسروں کو چننے کے لیے اپنی جماعت سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ صورت حال غالباً اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ نئی حلقہ بندیوں کے انتخابات کے نتیجے پر جماعت کے نہایت ہی راسخ ارکان کے علاوہ، دوسرے رکن اور ہمدرد، مخالف جماعت کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف اکثریت رکھنے والی جماعت میں صرف سرگرم اور مستقل مزاج ارکان ہی نہیں ہوتے بلکہ ایسے "نیم گرم" اور تذبذب میں مبتلا ہو جانے والے حمایتی بھی ہوتے ہیں جو بسا اوقات حزب اختلاف کے بہلاوے پھسلاوے میں آ جاتے ہیں۔ بہر صورت دونوں جماعتوں میں سے اقلیتی جماعت میں زیادہ ٹھوس اور مضبوط عنصر کی وجہ ہی سے ایک زندہ اور زندہ رہنے کے قابل دو جماعتی نظام برقرار رہتا ہے۔

جانبدار اور غیر جانبدار رائے دہندگان

آزاد خیال اور آزاد رائے دہندگان کو امریکہ میں کئی نسلوں تک عیاری اور مثالی بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک ایسے شہری کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنا ووٹ ڈالنے اور فیصلہ کرنے سے پہلے جماعتوں، امیدواروں اور مسائل کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ روایتی، بلکہ افسانوی آزاد خیال ووٹر انتخابی مہم کو شروع سے آخر تک سمجھتا ہے۔ یہ کسی جماعت

کے بارے میں جم کے تقاضے سے کچھ پہلے ہی کوئی تبصرہ کرے گا۔ اور اس
مرحلہ پر بھی وہ اپنی جمع کردہ تمام شہادت کو نہایت غور و تفکر کے ساتھ
جانچے اور پرکھے گا اور اس وقت یہ آخری فیصلہ کرے گا کہ جماعت
"ب" کا امیدوار "الف" ایک سوچنے والے آدمی کے ووٹ کا
مستحق ہے۔

اس تصور نے انیسویں صدی کے آخری برسوں میں فروغ پایا کہ
شہری جتھا بندی سے گریز اور سیاسی آزاد خیالی اچھی باتیں ہیں۔ اس
دور کے لکھنے والوں نے فرقہ پسند ووٹر کی تصویر ایک ایسے ان پڑھ
منتقل ہونے والوں کی حیثیت سے کھینچی ہے جسے اس کی طرح کے دوسرے انسانوں
کے ریوڑ کے ساتھ ہنکا کر اس کے سیاسی آقا اور اس کے حاشیہ بردار
انتخاب گاہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ جانبدارانہ منظم سیاست اور
عوامی جماعتوں سے بالکل بے بہرہ سمجھا جاتا۔ وہ شخصی وفاداری کی وجہ
سے اپنے سیاسی آقا کی فرمانبرداری کرتا یا اس لیے کہ اس کے ووٹ
کو مشین نے خرید لیا تھا۔ یہ فرقہ پسند ووٹر مشین، سیاسی جماعت
انتظامیہ کو اپنا ووٹ دیتا اور بد قماشی اور بے انتظامی کے ذمہ دار عنصر
کے بجائے سیاسی نظام کی پیداوار سمجھے۔

اس طرح آزاد خیال ووٹر کی ذات پر اعتماد سیاسی نظام اور
سیاسی جماعتوں کے خلاف دانشوروں کی مخالفت سے وابستہ تھا۔ وہ
یہ سمجھتے تھے کہ اگر جماعتوں کی رہنمائی وہ بادیانت رہبر کریں جو آزاد

اور دولت کی قربان گاہ پر معاشرہ کو بھینٹ چڑھانے میں تذبذب محسوس نہ کریں تو جماعتی وفاداری یقیناً حکومت میں ایک مسلسل اور جاری رہنے والی برائی کے امکانات کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اس سیاسی اور جماعتی انتظامیہ کو شکست دے کر ہی ایک دیانت دار اور ایمان دار حکومت کی از سر نو تشکیل کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان سیاسی اور جماعتی انتظامیہ کو اسی صورت میں توڑا جا سکتا ہے جب رائے دہندگان اپنی جماعتی وفاداریوں کے رجحانات پر غالب آ جائیں۔ چونکہ غور و فکر سے عاری افراد بددیانت سیاسی جماعتوں کے حامی تھے۔ اسی لئے معاشرہ کے ہوتے والے افراد کے لئے یہی صورت تھی کہ وہ سیاسی طور پر آزاد رہیں۔

انیسویں صدی کی سیاست کی اس تصویر کے کچھ ٹکڑے یقیناً ان شہروں میں حقیقی تھے جہاں نئے منتقلین کبھی کبھی بددیانت جماعتی تنظیموں کا وسیلہ اور ذریعہ بنتے تھے لیکن یہ بات بھی کہنی ضروری ہے کہ یہ سیاسی تنظیمیں اکثر اوقات ان منتقلین کو لوٹ کھسوٹ اور استحصال سے بچاتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہی سیاسی نظام اور سیاسی جماعتیں امریکہ میں نئے آنے والوں کے امریکی زندگی میں انجذاب کا حقیقی ذریعہ تھیں انہیں جماعتوں کے ذریعے یہ نو وارد "امریکی" بنتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں صورت حال کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن آج جائزہ اور تحقیقات کا جو مواد موجود ہے، اس کی روشنی میں آزاد ووٹر کی مفروضہ خوبیاں بڑی حد تک مشکوک ہیں۔ تمام جائزوں نے اس مثالی

تصویر کی تردید کی ہے۔ ان مطالعوں اور جائزوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو ووٹر کسی انتخابی مہم کی ابتدا ہی میں کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں، اس کی حقیقی بنیاد دونوں سیاسی جماعتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ان کی وہ وفاداری اور وابستگی ہوتی ہے جو غیر واضح طور پر دل و دماغ میں) پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انتخابی مہم کے آغاز ہی میں فیصلہ کر لینے والے، یہ دونوں ان مطالعوں کی روشنی میں، وہ افراد ہوتے ہیں جو اخبار پڑھتے ہیں، ریڈیو پر امیدواروں کے خطابات سنتے ہیں اور ٹیلی ویژن کے سیاسی پروگرام دیکھتے ہیں۔ وہ ان مسائل کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں جو ہر تنقید کے خلاف ان کی جماعت اور امیدواروں کی مدافعت کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ حزب اختلاف کے امیدواروں کی تقریریں نہ سنتے ہوں اور وہ اخباری کالم نہ پڑھتے ہوں جن میں ان کے پسندیدہ امیدواروں پر تنقید کی گئی ہو لیکن وہ اس بات کا ایک ذہنی اور فکری تصور ضرور رکھتے ہیں کہ وہ ایک آدمی کے حق میں اور دوسرے کے خلاف کیوں ہیں؟ ـ یہ ذہنی تصور ممکن ہے کہ کسی غلط تصور پر مبنی ہو، مگر کم سے کم اس کی ایک عقلی بنیاد ضرور ہوتی ہے۔

اس کے برعکس نام نہاد "آزاد ووٹر"، حلقۂ رائے دہندگان میں سب سے کم معلومات رکھتے ہیں۔ وہ ایک انتخابی مہم کی گہما گہمی اور عروج کے زمانے میں بھی بہت کم پڑھتے ہیں اور بہت کم سیاسی نشریات سنتے

ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مساوات ہم کے آخری چند ہفتوں بلکہ دنوں تک کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے لیکن جب وہ آخر الامر کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو بالعموم وہ بہت ہی نامکمل اور ادھوری شہادت پر مبنی ہوتا ہے۔

وی۔او۔ کے (V. O. Key) نے ہمیں بتایا ہے کہ "جس شخص کو (حکومت کی) پالیسی سے جس قدر کم دلچسپی ہوگی اور اس باب میں اس کی معلومات جس قدر محدود ہوں گی، اسی قدر اس کے انتخاب میں حصہ نہ لینے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ اور جس شخص کو پالیسی اور مسائل حکومت سے جس قدر زیادہ سیاسی دلچسپی ہوگی اسی قدر اسے انتخاب میں حصہ لینے سے دلچسپی ہوگی اور اس کی رائے کی سمت بھی متعین ہوگی۔ لیکن وہ لوگ سیاست سے اس قدر کم وابستہ ہوتے ہیں کہ انہیں انتخابات کے نتائج اور ان کی الٹ پھیر کی پروا بھی نہیں ہوتی"۔ اس تبصرہ کے بعد مسٹر کی نے جائزہ کے تحقیقاتی مرکز کے نتائج کا حوالہ دیا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو لوگ اس بات کی بہت پروا کرتے ہیں کہ کون سی جماعت جیتے گی ان میں سے ۸۲ فی صد تو اپنے ووٹ ڈالتے ہیں۔ وہ لوگ جو کسی حد تک پروا کرتے ہیں ان میں سے ۶۹ فیصد انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو "بہت زیادہ پروا نہیں کرتے" صرف ۶۰ فی صد انتخابات میں رائے دیتے ہیں اور "بالکل پروا نہ کرنے" والوں میں سے صرف ۵۵ فیصد اپنے حق رائے دہندگی کو استعمال کرتے ہیں۔

وی۔ او۔ کے نے یہ بحث اپنی کتاب "عوامی رائے اور امریکی جمہوریت"

میں پیش کی ہے۔

ایک اور حالیہ جائزہ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ سیاست میں دلچسپی ماں باپ سے بچوں میں منتقل ہو سکتی ہے۔ "وہ لوگ جن کے ماں باپ کو سیاست سے بہت زیادہ دلچسپی تھی، ۱۹۵۸ء کی انتخابی مہم سے ان لوگوں سے کم از کم دوگنا وابستہ رہے جن کے والدین کو سیاست سے کمتر درجہ کی دلچسپی تھی۔ ایک حیرتناک حقیقت یہ ہے کہ سیاست سے کم دلچسپی رکھنے والے خاندانوں کے بچے بہت بڑی تعداد میں سیاست سے دامن کشاں رہتے ہیں اور دوسری طرف سیاست سے نہایت درجہ دلچسپی رکھنے والے خاندانوں میں یہ بات ممکن ہے کہ بچے زیادہ شدت کے ساتھ سیاست کو نہ اپنائیں۔ بہت کم سیاسی دلچسپی رکھنے والے خاندانوں کے بچے شاذ و نادر ہی سیاست کو بڑے پیمانے پر اپناتے ہیں اور سیاست سے گہری وابستگی پیدا کرتے ہیں"۔ اس جائزے کو بھی مسٹر کے نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔

ووٹر، مسائل اور سیاسی جماعتیں

ایک عام اور وسیع مفہوم میں طبقاتی مسائل رائے دہندگان کے سیاسی تعلق کے تعین میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں جماعتوں میں سے کسی کو اصطلاحی طور پر اور حقیقی معنوں میں طبقاتی جماعت نہیں کہا جا سکتا۔ سیمور مارٹن لپ سٹ (Seymour Martin Lipset) نے امریکی جماعتوں اور سیاست کے اہم تاریخی مطالعوں پر تبصرہ کیا ہے اور وہ اس نتیجہ

پہنچے ہیں کہ طبقہ جماعتی وابستگی کے سلسلہ میں ووٹروں کی پسند میں سب سے اہم جز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس بات کا پہلے ہی مطالعہ کر چکے ہیں کہ مزدور ۲ اور ۱ کے تناسب سے ڈیموکریٹک جماعت کی حمایت کرتے ہیں اور تاجر و پیشہ ور افراد کم و بیش اسی نسبت سے ری پبلکن جماعت کے حامی ہیں۔ لیکن یہ اطلاع (اور جائزہ) ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ انفرادی مسائل کے بارے میں رائے دہندگان کس طور پر محسوس کرتے ہیں اور نہ یہ جائزہ اس بات کی کوئی تشریح و تاویل کرتا ہے کہ ایک تہائی مزدور ری پبلکن کیوں ہیں اور ایک تہائی تاجر ڈیموکریٹ کیوں ہیں؟ — آئیے ذرا ہم اپنی توجہ ان غیر معمولی سیاسی مظاہر کی تفہیم جو تشریح کی طرف مبذول کریں۔

سیاسی جائزوں کے مطابق مختلف سیاسی جماعتوں سے متعلق مزدور زیادہ تر معاشی اور سماجی مسائل پر بنیادی طور پر ایک سے نظریات رکھتے ہیں۔ جو ری پبلکن جماعت کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ ڈیموکریٹ امیدواروں کے حامیوں کی نسبت قدرے رجعت پسند ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب کم و بیش ایک ہی قسم کے سرکاری فیصلوں اور اقدام کی خواہش رکھتے ہیں۔ مختلف جماعتوں کے لئے اپنے ووٹوں اور ہمدردی کی تاویل مزدور اپنے اس اندازہ اور تخمینہ کی بنیاد پر کرتے ہیں کہ آگے چل کر کون سی جماعت ان مسائل کے بہتر حل پیش کر سکے گی جن سے ان کی رائے میں ملک دوچار ہے۔ ڈیموکریٹک جماعت کے حامی

تاجر کم و بیش وہی نظریے اور خیالات رکھتے ہیں جو ری پبلکن جماعت کے حامی تاجر رکھتے ہیں، لیکن وہ اس بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں کہ ان میں سے کون سی جماعت تاجروں کے الجھے ہوئے اور مسلسل مسائل کو بہتر طور پر حل کر سکے گی۔

عام طور پر وہ مزدور جو ری پبلکن جماعت کو اور وہ تاجر جو ڈیمو کریٹک جماعت کو ووٹ دیتے ہیں، ایسے گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں جو پہلے ہی سے ان جماعتوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جماعتوں سے اس درجہ اور اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ ان کی وفاداری اور وابستگی ناقابل شکست ہوتی ہے کسی جماعت کا کوئی عمل اور کوئی اعلان بھی ان کی ترجیحی جماعت سے ان کے تعلق میں ادنیٰ سی لرزش بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اپنے مقاصد اور اپنی جماعت کے مقاصد کے تناقض اور تضاد کو یا تو نظر انداز کر دیتے ہیں یا پھر ایسی دلیلیں کبھی کبھی نہایت پیچیدہ اور الجھی ہوئی دلیلیں، وضع کرتے ہیں جن کی مدد سے وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ جن پر وگراموں کو وہ عزیز جانتے ہیں، ان کی جماعت ہی آخرالامر ان پر وگراموں کو اپنا لے گی اور آگے بڑھائے گی۔

مسائل حاضرہ سے آگاہی

اگر رائے دہندگان کبھی کبھی اپنی خواہشات اور جماعتی پالیسی کے درمیان تناقض و تضاد کے باوجود اپنی جماعتی وفاداری

کو قائم رکھتے ہیں تو ان ووٹروں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو اس
جماعت کی حمایت کرتے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق ان کے مقاصد
و مفاد کی آئینہ دار ہو؟ کیا یہ لوگ تمام موجودہ مسائل سے باخبر ہوتے
ہیں، اور کیا یہ لوگ ہمیشہ کسی خاص قانون کی منظوری کے سلسلے میں یا
اس کی مخالفت میں اپنی منتخبہ جماعت کے رہنماؤں کا ساتھ دیتے ہیں؟
ان سوالوں کے جوابات رائے دہندگان کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔
ان میں سے بہت سے ووٹر مخصوص مسائل پر اپنی جماعت کے موقف
کو اپناتے ہیں اور اس کی تائید کرتے ہیں۔ اور کبھی یوں معلوم ہوتا
ہے جیسے ووٹروں کی جماعتی وابستگی کا ان روزمرہ کے مسائل سے
کوئی تعلق نہیں ہے جن سے آئے دن صدر اور کانگریس کو دوچار ہونا
پڑتا ہے، بلکہ اس وفاداری کا انحصار جماعت کی بنیادی یا دوررس ترجیح
کی پالیسی پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں کہہ لیجیے کہ کچھ ڈیموکریٹک
رائے دہندگان نے ان مخصوص قانونی اقدامات و تجاویز کے پورے سلسلہ
کی مخالفت کی ہو جو ۱۹۶۲ء میں کانگریس کے زیرِ غور رہے تھے — لیکن
اس کے باوجود انہوں نے ملک میں فوری معاشی مسائل اور بحران کا مقابلہ
کرنے کے لئے قومی حکومت کے ان اختیارات کے استعمال کی تائید اور
حمایت کی جن کی حمایت ڈیموکریٹک جماعت اور اس کے ارکان کرتے رہے
تھے۔ اسی طرح یہ بات بھی ممکن ہے کہ جو لوگ سماجی اور معاشی معاملات اور
نظام میں وفاقی مداخلت کی طویل مخالفت میں ری پبلکن جماعت کے حامی

اور ہم نوا ہوں، وہ حالیہ مسائل پر اس جماعت کے مخصوص موقف کی
مخالفت کریں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح دوسرے ملکوں کے بیشتر لوگ اپنے
ملک کی پالیسی کی تشکیل کے نکات کو نہیں سمجھ سکتے، اسی طرح امریکہ کے
بیشتر افراد ان روزمرہ کے مسائل اور اقدام کو نہیں سمجھ سکتے جن پر
کانگریس بحث اور غور کر رہی ہو۔ مخصوص گروہ انہیں اقدامات کا نہایت
غور و فکر سے مطالعہ کرتے ہیں جو ان کے فوری مفادات کو متاثر کرتے
ہوں۔ مثال کے طور پر نیگرو اور جنوب کے سفید فام رجعت پسند باشندوں
سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ شہری حقوق کے سلسلہ میں تمام آئینی
تبدیلیوں اور ارتقا کا غور سے مطالعہ کریں اور دوسرے مسائل پر بہت
کم توجہ دیں مثلاً قانون محاصل یا غیر ملکی امداد۔

غالباً دس فیصد سے زیادہ امریکی رائے دہندگان ان تمام اہم
مسائل کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کرتے جن کا سال بہ سال ملک کو سامنا
کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جیسا کہ (   ) نے کہا ہے "اگر امریکی ووٹروں
میں سے صرف دس فیصد بھی کسی مسئلہ کے متعلق واضح اور مضبوط رائے
رکھتے ہیں تو بھی یہ تعداد ایک کروڑ کے لگ بھگ ہو جاتی ہے۔ ملکی اور
سیاسی مسائل سے اتنے افراد کی وابستگی بھی جمہوری اور غیر جمہوری نظاموں
میں حکومت اور شہریوں کے درمیان تعلق، عمل اور رد عمل میں نمایاں
فرق پیدا کر دیتی ہے۔"

جیسا کہ ہم آگے بڑھ کر مطالعہ کریں گے، نت نئے اہم مسائل پر مختلف رائے رکھنے والوں کی کشمکش اور جد و جہد، حکومت کے فیصلہ کرنے کے طریقہ کار کو متاثر کرتی ہے اور کر سکتی ہے۔ ان کی یہ جد و جہد عوامی عہدہ داروں کے درمیان بحث کے تسلسل کو جاری رکھنے میں مدد دیتی ہے۔

عوامی رائے کے مطالعوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روز مرہ کے معاشی مسائل کے بارے میں جو مال روٹی کی اصطلاحوں میں سادگی سے بیان کئے جا سکتے ہیں اونچی آمدنی کے گروہوں کے مقابلے میں مزدور زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ دوسری طرف زیادہ پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسائل کے متعلق زیادہ آمدنی والے گروہوں کے افراد زیادہ جانتے ہیں۔ جیسا کہ سوسائٹی کے مختلف طبقات کے اندر تقسیم کی ابتدائی بحثوں سے توقع کی جا سکتی ہے، سوسائٹی کے تمام طبقوں میں کچھ ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جو بیشتر اہم ملکی سماجی اور معاشی مسائل کے بارے میں مدافعت یا مخالفت پر متحد ہو جاتے ہیں۔ یوں طبقاتی حدود مٹ جاتے ہیں یا یوں کہیے کہ مختلف طبقوں کے خطوط ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور یہ عمل ایک جمہوری معاشرہ کے قیام کے تسلسل اور کام کو جاری رکھتا ہے۔

قدامت پسند اور آزاد خیال

اس باب میں اور آنے والے ابواب میں بارہا "قدامت پسند"

اور "آزاد خیال"، یہ دونوں لفظ یا اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں! ان الفاظ ایک وسیع مفہوم وہ ہے جسے عام طور پر دانشوروں نے تسلیم کرلیا ہے جب یہ الفاظ اس مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کی معنویت خاصی ٹھوس ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ الفاظ معاشرہ کے دوسرے گروہوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان اصطلاحوں کے مسلمہ معنوں میں ہر قسم کے استثنیٰ کی گنجائش اور ضرورت ہوتی ہے۔ یا پھر یہ کہ ان اصطلاحوں کو سرے ہی سے ترک کر دیا جائے۔ ہم ان اصطلاحوں کو ان کے مسلمہ مفہوم ہی میں استعمال کریں گے لیکن اس موقع پر اس فرق کی وضاحت بھی کریں گے جو ایک ہی "لیبل" (لقب) رکھنے والے دانشوروں اور معاشرہ کے دوسرے گروہوں کے درمیان موجود ہوتا ہے

لفظ کے عام استعمال کے مطابق اگر آج کسی کو آزاد خیال (لبرل) کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ شخص سماجی اور معاشی شعبوں میں حکومت کی زیادہ مداخلت کی ضرورت پر ایمان رکھتا ہے اور یہ بڑھتے ہوئے سماجی تحفظات، دسکولوں کی امداد کی قومی کوششوں، اور ایسے مسائل کی زیادہ وسیع قومی حمایت کے حق میں ہے جیسے بوڑھے لوگوں کی طبی امداد وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس (لبرل) کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ شخص غالبًا پولیس اور اظہار رائے پر پابندیوں کے خلاف بھی ہے اور

ان مراحل پر عجیب دوسرے لوگوں کے نزدیک ایسی تجدید کا گہرا اور قریبی رشتہ قومی تحفظات سے ہو سکتا ہے۔ لبرل فرد بلا تمیز نسل و مسلک تیزی کے ساتھ تمام لوگوں کی حیثیت کو مساوی بنانے کا حامی بھی ہوگا، حکومت کے وسیع تر فرائض کے اخراجات کی ادائیگی کے لئے ٹیکسوں میں اضافہ کے لئے بھی تیار ہوگا اور وہ غالباً اقوام متحدہ کا پُرجوش حامی اور دوسرے ملکوں کی امداد میں اضافہ کا بھی زبردست مؤید ہوگا۔ دو قوموں کے درمیان جھگڑوں اور مناقشوں کے حل کے سلسلہ میں بین الاقوامی کانفرنسوں اور باہمی گفت و شنید پر بھی ایمان رکھتا ہوگا۔ ایسی قوموں کے درمیان بھی جن کے نظریات اور عملی مقاصد ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہوں۔

اوپر کے پیراگراف میں لبرل کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، ضروری نہیں کہ تمام آزاد خیال دانشور ان میں سے ہر صفت کے قائل ہوں، لیکن توقع اسی بات کی ہے کہ وہ تینوں شعبوں میں ان میں سے بیشتر باتوں کو قبول کریں گے اور ان کی حمایت کریں گے تینوں شعبوں سے مراد ہے سماجی اور معاشی میدانوں میں حکومت کی توسیع پذیر کوشش شہری حقوق اور آزادیوں کی ترقی اور بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے میں غیر ملکی امداد اور بین الاقوامی اجتماعات کی افادیت پر یقین۔

امریکہ میں قدامت پسندوں کی یہ تعریف درست نہ ہوگی کیونکہ یہ لوگ ان تمام اقدام کی مخالفت کرتے ہیں، جن کی حمایت کی توقع آزاد خیالوں سے کی جا سکتی ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ قدامت پسند حکومت کی مداخلت

کے ذریعہ داخلی مسائل کے حل پر یقین نہیں رکھتا۔ عام حالات میں وہ شہری حقوق اور شہری آزادیوں کی مخالفت نہیں کرے گا، لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ نسلی مساوات میں تدریجی مراحل (اور آہستہ خرامی) کی حمایت کرے اور جہاں قومی تحفظ یا عوامی اخلاق پر برا اثر پڑنے کا قوی امکان ہو وہاں پریس اور اظہار رائے پر (مناسب) پابندی کی حمایت کرے بین الاقوامی دائرہ میں توقع یہی ہے کہ قدامت پسند بین الاقوامی تنظیموں، کانفرنسوں اور معاشی امداد سے زیادہ ملکی دفاع اور وسائل اور تیاریوں اپر بھروسہ کا اظہار کرے گا۔ اگر ہم قدامت پسند کی اصطلاح کو ان دانشوروں تک محدود کر دیں جو سیاست میں دلچسپی لیتے ہیں تو یہ بیان بڑی حد تک درست ہے، اگرچہ بعض قدامت پسند دانشور متذکرہ بالا باتوں میں سے کچھ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔

مختلف پیشہ ور گروہوں کے نقاط نظر کے مطالعہ سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سیاست میں حصہ لینے والے یا سیاست کے بارے میں لکھنے والے دانشوروں کے علاوہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں "آزاد خیال" اور "قدامت پسند" قرار دیا جا سکے، معاشرہ کے باقی افراد کے بارے میں تو محض امکان اسی بات کا ہے کہ وہ آزاد خیالی کے مسلک کی کچھ باتیں قبول کر لیں اور اسی طرح قدامت پسندانہ روش کے بعض پہلوؤں کو اپنا لیں۔

جائزہ کے تحقیقاتی مرکز نے دس سال سے زیادہ مختلف مسائل پر امریکیوں کی رائے عامہ کا مطالعہ کرنے کے بعد، یہ نتیجہ اخذ کیا ہے

کہ "داخلی اور خارجی مسائل کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں افراد کی آرا میں کوئی درجہ واری نسبت اور مشترک پیمانے کا سا رشتہ نہیں ہے۔ بیرونی مسائل میں مداخلت کا موقف ایک داخلی قدامت پسند اور داخلی لبرل دونوں کا ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح ایک نسبتاً علٰحدگی پسند واشنگٹن میں سماجی بہبود کی سرگرمیوں کی تائید بھی کر سکتا ہے اور مخالفت بھی (دونوں باتوں میں سے کوئی بھی ممکن ہے)

مقامی نوعیت کے کچھ اور سیاسی مطالعوں سے پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ سماجی بہبود کی قانون سازی کی ترقی کے لئے قومی انتخابات میں ڈیموکریٹک جماعت کو ووٹ دیتے ہیں، وہی لوگ مزید عوامی پارکوں اور باغوں کی تعمیر پر اخراجات کی مخالفت کر سکتے ہیں یا ایسی ثقافتی سرگرمیوں کی مخالفت جیسے میونسپل سمفنی آرکسٹرا۔ اور یا وہ لوگ ایسے بنیادی فرائض کی مخالفت بھی کر سکتے ہیں جیسے کوڑا کرکٹ کے انفرادی انتظام کی جگہ مقامی شہری ادارہ کا انتظام۔ یہ لوگ شہری ان ترقیوں اور بہبودی کے اقدام کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ان کا رشتہ ٹیکسوں میں اضافے سے جوڑتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ٹیکس انہیں بھی ادا کرنے ہوں گے اس کے برعکس تاجروں اور پیشہ ور لوگوں کی وہ اکثریت جو قومی انتخابات میں عام طور پر ری پبلکن جماعت کو ووٹ دے گی (کیونکہ یہ لوگ سماجی بہبود کی قانون سازی میں توسیع کی مخالفت کرتے ہیں) شہری اداروں اور بلدیہ کی ایسی کوششوں کی حمایت کرے گی جن کا مقصد پارکوں کو بہتر بنانا ہو یا ثقافتی اور

تہذیبی سرگرمیوں کے مواقع بہم پہنچانا ہو، وغیرہ وغیرہ[۳۵]،

ان معلومات کو مجموعی طور پر سامنے رکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو سکہ بند یا مکمل "آزاد خیال" یا "قدامت پسند" کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ سوائے دانشوروں کے کم و بیش کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس کے نظریات داخلی اور خارجی مسائل پر محیط ہوں، یا کم سے کم یہ نظریے صاف صاف اور نمایاں طور پر "آزاد خیال" اور "قدامت پسند" کے سانچوں میں ڈھل سکیں۔

ملکی اور عالمی شعبوں کے مختلف مسائل پر ووٹروں کی یہ تقسیم سیاسی جماعتوں کی مہم پر یقینی طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کانگریس اور مقامی عہدوں کے منتخب شدہ نمائندوں کے عمل کی راہ متعین کرنے میں اس تقسیم رائے کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ ہم ان نتائج میں سے بعض کا سراغ اس کتاب کے ان ابواب میں لگائیں گے جن کا تعلق سیاسی جماعتوں اور ان مسائل سے ہے جن سے کانگریس کے رکن مختلف قسم کی قانون سازی کے وقت اپنے رائے دہندگان کی نمائندگی کے خیال سے دوچار ہوتے ہیں۔

---

[۳۵] مقامی اداروں میں افراد کے رویوں اور رجحانات کے متعلق ان معلومات کے لئے ہم رابرٹ ایگر، یونیورسٹی آف اوریگون کا ممنون ہوں، جنہوں نے دوسرے مسائل کے علاوہ اس مسئلہ پر بھی اپنی یونیورسٹی کی ایک تقریر ۱۹۶۰ء میں روشنی ڈالی۔

۴

شہریوں کے مفاداتی گروہ

کسی بھی جمہوری معاشرے میں ووٹروں کو درمیانی گروہوں کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ عوامی حکمت عملی کے امور میں وہ اپنے نقطہ نظر کا موثر اظہار کر سکیں دو قسم کے ادارے امریکی رائے دہندگان کے اصل مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ منظم مفاداتی گروہ شہریوں کی مخصوص ضروریات کے اظہار کا وسیلہ ہیں اور سیاسی جماعتیں عام مفادات کے اظہار کا ذریعہ۔ اس باب میں ہم مفاداتی گروہوں کے نظام اور ان کی اقسام کا ذکر کریں گے — اگلے باب میں امریکی سیاسی جماعتوں کی نوعیت و کارکردگی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

پہلی ترمیم کے تحت ہر شہری کو آزادی تقریر، پرامن اجتماع اور زیادتیوں کی تلافی کے لئے عذرداری کے حقوق حاصل ہیں — یہ حقوق مجموعی طور پر شہریوں کو رائے دہندگی کے علاوہ حکمت عملی کے امور میں حصہ لینے کی آزادی کا یقین دلاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہر شعبہ کے افراد نے ایک دوسرے کے دوش بدوش ایسی پالیسی اختیار کرنے کے لئے دباؤ ڈالا ہے جو ان کے مخصوص اقتصادی، سماجی اور تفریحی مفادات کا تحفظ کر سکیں

اور ان ضروریات کو پورا کرسکیں۔

منظم مفاداتی گروہ، جو بعض اوقات اثراتی گروہ (Pressure Groups) بھی کہلاتے ہیں، اپنے ارکان کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ وہ عوام کی نمائندگی کی کوشش نہیں کرتے، نہ وہ رائے دہندگان کی منظوری یا نامنظوری کے لئے کوئی نمائندہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ کوشش کرتے ہیں کہ عوامی نمائندوں اور افسروں کو ایسے قوانین وضع کرنے یا قوانین کو نافذ کرنے کی معقولیت اور ضرورت کا قائل کرلیں جو اُن کے مخصوص گروہ کے لئے مفید ہوں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اثراتی گروہوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ریاستی صدر مقامات اور واشنگٹن میں مزدوروں کی نمائندگی کے لئے مزدور یونینیں یعنی امریکن فیڈریشن آف لیبر۔ کانگریس آف انڈسٹریل مزدور کانگریس کا اجتماعی وفاق (AFL-CIO) موجود ہیں۔ صنعت کاروں کی قومی انجمن (این۔ اے۔ ایم (N.A.M.)) بڑے صنعت کاروں کی نمائندہ ہے۔ ملک کے ہر شہر اور قصبے کے چھوٹے تاجروں کی قومی انجمن بھی ہے یعنی ریاستہائے متحدہ کا ایوان تجارت (United States Chamber of Commerce)

امریکی کسان بڑے جماعتی گروہوں سے کسی ایک کو چن سکتا ہے شعبۂ زراعت کا امریکی وفاق (The American Farm Bureau Federation)، کاشتکاروں کی انجمن (Farmer's Union) اور گرینج

(Grange) - مذہبی نمائندگی کے لئے عیسائیوں اور یہودیوں کی
امریکی کونسل (American Council of Christians & Jews)
عیسائی گرجوں کی قومی کونسل (National Council of Churches
of Christ) اور کیتھولک یہود کی قومی کونسل (National
Catholic Welfare Council) کے علاوہ بھی (عیسائیوں کے)
ہر مذہبی فرقہ کی نمائندگی کے لئے گرجوں کی الگ الگ تنظیم ہے ——
شکاریوں اور ماہی گیروں کی نمائندگی کے لئے متعدد تحفظاتی گروہ ہیں
جو ایسے قوانین وضع کرنے کے لئے دباؤ ڈالتے ہیں جن کے تحت جانوروں
اور مچھلیوں سے بھرپور علاقوں کو صنعتی مقاصد کے لئے استعمال کرنے
سے محفوظ رکھا جائے اور جانوروں اور مچھلیوں کو تجارتی مفادات سے
بچایا جائے۔ سیاہ فام افراد کی بہبود کی قومی انجمن (National
Association for the Advancement of Colored People)
نسلی مساوات کی کانگریس (Congress of Racial Equality)
اور شہری جماعت (Urban League) نسلی گروہوں کی
نمائندگی کرتی ہیں وہ لوگ جو حکومت کی اصلاح چاہتے ہیں متعدد
گروہوں میں سے کسی ایک میں شامل ہو سکتے ہیں۔ عورتوں کے لئے،
عورتوں کی جماعت رائے دہندگان League of Women Voters
ہے جو ہر سطح پر حکومت کی اصلاح چاہتی ہے —— امریکی برائے جمہوری
عمل The Americans for Democratic Action

اور "کمیٹی برائے موثر تر کانگریس" Committee for a More Effective Congress press.) یہ جماعتیں داخلی اور خارجی امور میں زیادہ آزادی پسند (Liberal) پالیسی کے لئے دباؤ ڈالتی ہیں۔ مختلف شعبہ کے آزمودہ کار (Veteran) لوگ گروہوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر سکتے ہیں جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ زیادہ بہتر طور پر ان کے مفادات کی نمائندگی کر سکتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ شہری ان گروہوں میں شامل ہوتے ہیں جن کے ممبران کے سیاسی اور اقتصادی نظریات ان کے نظریات کے مطابق ہوں۔ افراد اپنے طور پر عوامی مسائل کے بارے میں سوچ سکتے ہیں لیکن وہ ان جماعتوں کا رکن ہونا پسند کرتے ہیں جن کے ارکان ان کے ہم خیال ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی مسائل میں خاندانوں کا رجحان ہم خیالی اور اتفاق کی طرف ہے۔ اگر ایسا نہ ہو، تو وہ حالات پیدا ہو جائیں گے جو خاندان کے ایک یا اس سے زائد افراد کو متاثر کریں گے۔ بڑے اور وسیع لیکن کم گہرے اور قریبی گروہوں میں ہم خیالی اور باہمی منظوری کے لئے اگرچہ اتنا زیادہ دباؤ نہیں ہوتا لیکن یہ ضروری ہے وہ یقیناً ایک غیر معمولی آدمی ہوگا کہ وہ کسی ایسے گروہ کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لے سکے جبکہ ارکان شدت سے اس سے اختلاف رکھتے ہوں۔ جب ایسے حالات سے سابقہ پڑتا ہے تو ایک عام آدمی یا تو جماعت سے مستعفی ہو جاتا ہے یا بے عمل۔ جو شخص کسی گروہ میں جتنا کم فعال ہوگا، اتنا

ہی وہ اس بات پر کم دھیان دے گا کہ عوامی مسائل پر اس کے ساتھی اس سے متفق ہیں یا نہیں

مفاداتی گروہوں کی تنظیموں کی نوعیت

واشنگٹن اور تمام ریاستوں کے صدر مقامات میں ایسے ہزاروں بارسوخ گروہوں کے دفاتر ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ وہ منتخب عہدے داروں یا سرکاری عہدہ داروں کی تنظیموں کے فیصلوں پر اثر ڈال سکیں۔ ان مفاداتی گروہوں کی تنظیمی ساخت میں خاصا فرق ہے۔ ان گروہوں کے طریقہائے کار ان کی تنظیم اور مقاصد کی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہم ان میں سے ہر ایک کی پوری طرح وضاحت نہیں کر سکتے۔

ان گروہوں کی ماہیت کی تشریح کے لئے سب سے آسان طریقہ یہ ہوگا کہ ہم چند ایسی قسمیں بنا لیں جو ان گروہوں میں سے بیشتر کا احاطہ کر سکیں۔ اور ایسا کرتے وقت ان گروہوں کی بعض خصوصیات کو نظر انداز کرنا ہوگا تاکہ وہ اس تقسیم پر پورے اتریں۔ لیکن اس تقسیم سے کسی ایسے اہم اور بارسوخ گروہ کی شکل مسخ کرنا مقصود نہیں جو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس وقت قائم ہے۔

اس بحث کے لئے ہم ان گروہوں کی چار قسمیں کریں گے۔ پہلی قسم میں ایسے گروہ ہیں جن کے ممبران کی تعداد انتہائی قلیل ہے لیکن عملے کے اخراجات اور عوامی رابطے کے کاموں کے لئے بڑی بڑی رقوم کے لئے

وسائل نسبتاً وسیع ہیں۔ ایسے گروہ کی واضح مثال صنعت کاروں کی قومی انجمن (این اے۔ ایم) ہے جس کے ارکان میں ملک کے چند بہت بڑے کارپوریشن شامل ہیں۔ دوسری قسم کی انجمنیں وہ ہیں جن کی آمدنی کے وسائل محدود ہیں لیکن جن کے ارکان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس قسم کی انجمن کی نمائندگی کے لئے ہم قومی انجمن برائے ترقی سیاہ فام افراد یعنی این۔ اے۔ اے۔ سی کو چن سکتے ہیں۔ تیسری قسم میں وہ چند خوش قسمت گروہ آجاتے ہیں جن کی رکنیت بھی وسیع ہے اور جن کے مالی وسائل بھی محدود نہیں۔ مثلاً امریکن فیڈریشن آف لیبر۔ کانگریس فار انڈسٹریل آرگنائزیشن (AFL - CIO.) چوتھی قسم میں وہ گروہ آتے ہیں جن کے پاس فنڈ کی کمی ہے لیکن جو اس عزت کی بنا پر خاصی مؤثر ہیں جو عوام میں ان کے ارکان کو حاصل ہے جوہری سائنس دانوں کا وفاق ایسے بارسوخ گروہ کی ایک اہم مثال ہے۔

یہ واضح ہے کہ بعض ایسے مفاداتی گروہ بھی ہیں جن کو ان میں سے کسی گروہ بندی میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ بیشتر ڈاکٹروں پر مشتمل امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن (اے۔ ایم۔ اے) کے ارکان کی تعداد بہت ہے اور اگر یہ چاہے تو پالیسی کی مخصوص تجاویز پر اثر ڈالنے کے لئے بڑی رقوم فراہم کر سکتی ہے۔ اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سرکاری افسران اور شہریوں کی غالب اکثریت ڈاکٹروں کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے جن میں سے بیشتر اس انجمن کے ارکان ہیں۔ امریکی انجمن کا

(اے۔ پی۔ اے) ایسے ہی گروہ کی دوسری مثال ہے۔ جو انھیں اسباب کی بنا پر کئی گروہوں میں شامل کی جا سکتی ہے۔

مفاداتی گروہ کا دائرہ عمل[۵۵]

حکومت کی پالیسی اور عوامی حکمت عملی پر اثر اندازی کی کوشش میں یہ مفاداتی گروہ کسی ایک یا پانچوں مسائل کو اپنا ہدف بناتے ہیں۔ کسی مخصوص پالیسی کی تبدیلی یا تنسیخ کے لئے سب سے پہلے وہ رائے عامہ کو ہموار کرتے ہیں۔ اول اپنے پیغام کو پڑھنے، سننے اور دیکھنے والے عوام تک پہنچانے کے لئے کئی اہم ابلاغی اور مواصلاتی نظام کو اپناتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی منتخب کردہ جماعت کی مالی امداد کے ذریعہ یا عام انتخابات یا ابتدائی انتخابات میں حصہ لے کر سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کی نامزدگی اور اس کے نتائج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ مفاداتی گروہ ان باتوں کی یقین دہانی چاہتے ہیں جو ان کے نزدیک اہم ہوتی ہیں اور جو ملک کی دونوں اہم جماعتوں کے سیاسی منشور میں شامل ہوتی ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مفاداتی گروہوں کے رہنما سیاست دانوں کی سرگرمیوں میں شامل رہتے ہیں اور رہنما بشمول ریاستی و قومی اجتماعات کی مقرر کردہ سیاسی منشور کی کمیٹیوں کے سامنے پیش ہوتے۔ چوتھے وہ اپنی بیشتر کوششیں قانون سازی کے

---

[۵۵] سپریم کورٹ کی توجیہ کے مطابق موجودہ قانون مفاداتی گروہوں کی سرگرمی کے اس پہلو کو تسلیم نہیں کرتا۔ کم از کم ۱۹۴۶ء کے تحت اس پہلو کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔

تمام مراحل پر مرکوز رکھتے ہیں۔ اور حصول مقصد کے لئے قانون ساز کمیٹیوں کے سامنے بھی پیش ہوتے ہیں اور قانون ساز اداروں کے نمائندوں کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کرتے ہیں۔ پانچویں ان سرکاری افسروں سے رابطہ پیدا کرنا جو قانون پر عمل درآمد کے ذمہ دار ہیں اور اس طرح قوانین کے نفاذ پر اثر انداز ہونا، یا قانون کی انتظامی تشریحات کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کرنا ان کا کام ہے۔

اثر اندازی کے طریقے | ہر منظم مفاداتی گروہ اپنے "نشانوں" کو متاثر کرنے میں جو طریقہائے کار استعمال کرتا ہے اس کا انحصار ان کی رکنیت کی تعداد اور اس رقم پر ہے جو اس گروہ کے قائدین اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے حاصل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایٹمی سائنس دانوں کی انجمن نہ تو تشہیر پر زیادہ مصارف برداشت کر سکتی ہے اور نہ ہی بہت بڑا عملہ ملازم رکھ سکتی ہے لیکن اس کے پاس ایک ایسی چیز ہے جو پیسے سے نہیں خریدی جا سکتی اور وہ ہے وقار و مقبولیت۔ ان کے مطبوعہ مواد کا مطالعہ علما و فضلا صحافیوں اور نشریات کے مبصروں کے حلقہ میں بکثرت کیا جاتا ہے بلیٹن کے ایڈیٹر کے نظریات سے اتفاق رکھنے والوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس بلیٹن کے حوالے بھی دیں گے جو صرف سائنسی منصوبوں ہی کی حمایت نہیں کرتے بلکہ ایسی تجاویز پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں جن کا تعلق خارجی پالیسی سے ہوتا ہے اس گروپ کے لوگ اس میدان میں کورسے ہوتے

ہیں لیکن ان کے ارکان کانگریس کی کمیٹیوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں، سرکاری اداروں کے سائنسدانوں کے ساتھ کام کرتے ہیں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں ان کے انٹرویو بھی ہوتے ہیں۔ معمولی سرمایہ، اور ارکان کی قلیل تعداد کے باوجود یہ گروہ سائنسدانوں کے وقار کی بنا پر زیادہ سے زیادہ رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

نیگرو باشندوں کی فلاح و بہبود کے ادارے اور مفاد عامہ و نسلی مساوات کی انجمنیں ایسے کتابچے اور خبرنامے شائع کرتی ہیں جو عوام اور سرکاری افسران کے لئے سنگین مسائل پیدا کر دیتی ہیں۔ ان اداروں کے ارکان عدالتوں میں نسلی تفریق کے مقدمات کی پیروی کرتے ہیں اور اپنی نسل کے افراد کو مساوی تحفظات اور حقوق نہ دینے والے سلوک کے خلاف مظاہرے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے مفاداتی گروہوں کی روزمرہ کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے لئے، عام اجتماعات میں تقریریں کرنا، اہم جماعتوں اور کانگریس کی کمیٹیوں کے سامنے پیش ہونا، کمیشن برائے شہری حقوق اور نسلی امور سے متعلق سرکاری اداروں کے ساتھ کام کرنا بھی ان کے معمولات میں شامل ہے

صنعت کاروں کی قومی انجمن اور ایسے تجارتی ادارے جن کے پاس ارکان کی محدود تعداد کے باوجود سرمایہ کی کثرت ہوتی ہے، ملکی اور بیشتر ریاستی صدر مقامات میں کثیر ملازم رکھتے ہیں۔ اس عملہ کا کام یہ ہے کہ قانون ساز اداروں کے ہمدردی رکھنے والے ممبروں کو ایسا

تحقیقی مواد بہم پہنچائے جو ان تجارتی اداروں کے مطلوبہ مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو۔ یہ گروہ اکثر و بیشتر قانون ساز اداروں کے ارکان کی ایسی تقاریر کی تیاری میں مدد کرتا ہے جن میں دونوں کا مفاد مشترک ہو۔ اس کے عملہ کا کام یہ ہے کہ ملک کے چھوٹے ہفتہ وار جرائد اور اخبارات کو ایسی تحریریں بھیجے جن سے ان کے مفاد کو تقویت پہنچتی ہو۔ اکثر کسی معاوضہ کے بغیر بھی یہ تجارتی گروہ اپنی کہانیاں اور فیچر اخبارات میں شائع کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ بعض رسائل و اخبارات کو ایسے مضامین کی بھی ضرورت رہتی ہے جس سے اخبارات کے صفحے پر کئے جا سکیں۔ ایڈیٹر صاحبان ان مضامین کے نقطۂ نظر سے بہر طور متفق ہوتے ہیں۔ جن شہروں کے اخبارات ان تجارتی گروہوں کے نقطۂ نظر سے ہمدردی نہیں رکھتے وہاں یہ گروہ اخبارات کے پورے پورے صفحات کو خرید لیتے ہیں تاکہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر سکیں۔ ان کے عملہ میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو قانون ساز کمیٹیوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور تقریر بھی کرتے ہیں۔ وہ تجارتی گروہ جو قانون کے تحت سرکاری ضابطوں کے پابند ہیں ایسے مخصوص سرکاری اداروں کے ساتھ جو ان ضابطوں پر عملدرآمد کے ذمہ دار ہیں مل کر کام کرتے ہیں تاکہ قوانین کی ایسی تشریح کرا لیں جو ان کے حق میں مفید ہوں۔

اے۔ ایف۔ ایل۔ سی۔ آئی۔ او (AFL - CIO) اور اس

سے الحاق شدہ یونینیں ملک کے ان چند خوش قسمت گروہوں میں سے ہیں جن کے مالی وسائل بھی لامحدود ہیں اور ممبران کی تعداد بھی بہت ہے۔ قریب قریب ملک کی تمام ٹریڈ یونینوں کے رضاکار اس کے ممبر ہیں۔ ہر چند کہ وہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے روپیہ خرچ کر سکتے ہیں لیکن مجموعی طور پر وہ ایسا نہیں کرتے (ہاں اپنی رکنیت کیلئے اخبارات ضرور شائع کرتے ہیں) بعض مواقع پر قانون ساز اداروں کے زیر غور امور پر اپنے روپیہ کی وضاحت کے لئے وہ ملک کے اہم اخبارات میں اشتہاری کالم خریدتے ہیں۔ وہ نشریات کے قومی پروگراموں میں اپنے کسی مبصر کے ذریعہ خبروں پر تبصرہ کرواتے ہیں۔ ان کے ممتاز رہنما جارج مینی (George Meany
والٹر ریوتھر (Walter Renther) جیمز کیری (
) کو اکثر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام میں حصہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ دوسرے مفاداتی گروہوں کی طرح مزدوروں کے نمائندے بھی قانون ساز کمیٹیوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور سرکاری اہلکاروں کے ہمراہ کام کرتے ہیں۔ اے ایف ایل سی آئی او کے واشنگٹن کے دفتر کا تحقیقی عملہ شہر کے سب سے بڑے عملوں میں سے ایک ہے۔ جب کوئی ایسا مسودہ قانون کانگریس کے زیر غور ہو جس کا اثر مزدوروں پر پڑتا ہو تو اے ایف ایل سی آئی او بہت بڑی تعداد میں ذہین لوگوں کو جمع کر لیتی ہے تاکہ کانگریس کے ممبروں سے اسکے

مفاد پہ تبادلہ خیال کر سکیں ـــ وہ سارے ملک میں یونین کے ممبروں کو اس بات پہ آمادہ کر سکتے ہیں کہ خطوط لکھ کر ایوان نمائندگان اور سینٹ کے ارکان کو مزدوروں کے مفاد کی حمایت کے لئے تیار کر لیا۔

مفاداتی گروہوں کی قوت

عموی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ منظم مفاداتی گروہوں کی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے لیکن اس میں کوئی یہ تعجب کی بات نہیں ہے مفاداتی گروہ کے قائدین اپنی قوت کے بارے میں اس خیال سے بھی مبالغہ آرائی کرتے ہیں تاکہ اپنی تنظیم اور کانگریس کے ارکان دونوں پر اثر ڈال سکیں۔ اس بات کا بھی پورا امکان ہے کہ ان کے مخالفین محض اپنے ممبران کے جوش میں اضافہ کے لئے اپنی حریف جماعتوں کی قوت کے بارے میں مبالغہ سے کام لیں جن کو وہ خود ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ صنعت کاروں کی قومی انجمن سرکاری افسران اور انتخابات پر اثر ڈالنے کے لئے مزدور تنظیم کی قوت کا ہیبت ناک خاکہ پیش کرے گی ـــ برخلاف اس کے اے ایف ایل ـ سی آئی او ـ تجارتی گروہ کی عظیم طاقت کی بات کرے گی۔

مفاداتی گروہ کے قائدین کی عظیم طاقت کے افسانوں کے پھیلانے کے لئے صرف ان گروہوں اور سیاسی امیدواروں کو ہی ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا، فضلا اور اخبار نویس بھی بعض اوقات اس کمزوری کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایسے گروہوں کے بارے میں لکھتے

ہوئے مصنفین کا عام طور پر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ گروہ نہ صرف طاقتور ہیں بلکہ ایک مصیبت بھی ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ذی اثر گروہوں کے مقاصد اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ ان گروہوں کے ارکان سوچتے ہیں کہ وہ صرف اپنی ہی بھلائی کے متمنی نہیں، بلکہ پورے سماج کی فلاح کو عزیز رکھتے ہیں، کیونکہ یہ اپنے مقاصد اور سوسائٹی کے مقاصد میں مطابقت پیدا کر لیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی گروہ بھی اتنا طاقتور نہیں ہے کہ مختلف مسائل سے متعلق، یا کسی محدود دائرہ میں طویل عرصہ کے لئے قانون سازی پر دباؤ ڈال سکے۔ یہ بات یقینی ہے کہ کسی بھی با اثر گروہ کی تجاویز سے دوسرا با اثر گروہ اختلاف کرے گا، سوا ایسے گروہوں کے جن کا مقصد بہت معمولی نوعیت کی قانون سازی سے متعلق ہو۔

پالیسی کے بعض امور پر کانگریس کے ممبران کا رویہ لچک دار ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ان کے دائرہ فکر سے مطابقت رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ کانگریس کے ارکان کی انتہائی قدامت پسندی کی بنا پر یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ مزدور تنظیموں کے نمائندے ان کی رائے دہندگی پر اثر انداز ہو سکیں۔ اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کانگریس کے آزاد خیال بازو کے ممبران کی فکر اور رائے دہندگی پر تجارتی ذی اثر گروہ (Business Pressure Groups) بہت کم دباؤ ڈال سکیں گے۔ داخلہ پالیسی کے اہم مسائل پر کانگریس کے نمائندے عموماً متفق ہو سکتے ہیں اور صرف اس وجہ سے کہ کوئی گروہ اس میں ... ملکی

کا مشورہ دیتا ہے تبدیلی ناقابل عمل ہے۔ حتیٰ کہ ایسی مزدور انجمنوں
کے اختیارات بھی محدود ہیں جو دوسرے نہایت مضبوط مفاداتی
گروہوں کی طرح طاقتور ہیں اور انتخابات پر اثر انداز ہونے کا
دعویٰ کرتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء کے انتخابات کے بعد ڈیماکریٹک جماعت
کو دونوں ایوان میں غالب اکثریت حاصل تھی۔ کانگریس کے بہت سے
کامیاب ممبروں کو انتخابی مہم میں مزدور تنظیموں کی حمایت حاصل تھی۔
اس کے باوجود لینڈرم۔ گرفن قانونی بل (Landrum
Griffin bill) کے سلسلے میں جب اظہار رقیت کا مرحلہ آیا
تو اے ایف، ایل سی آئی، او کو ارکان کانگریس کی وہ ضروری
امداد اور تعدادی تائید حاصل نہ ہوسکی جو اس قانون کی منظوری کو
روک سکتی۔ اس بل میں ایسی دفعات موجود تھیں جن کا مقصد مزدوروں
کے رہنماؤں کی مرضی اور منشا کے خلاف ٹریڈ یونینوں کی سرگرمیوں کو
ضابطہ کا پابند بنانا تھا۔

جو تجارتی گروہ عوام کے مفادات کے خلاف ہوتے ہیں، وہ
زیادہ مستحکم نہیں ہوتے۔ ۱۹۶۲ء میں جب فولاد سازی کے صنعت کاروں
نے فولاد کی قیمتوں میں اضافہ کا اعلان کیا تو ان کو اُمید تھی کہ کانگریس
کے ری پبلکن لیڈر ان کی حمایت کریں گے لیکن کسی نے ان کا ساتھ
نہیں دیا۔ ان دونوں معاملات میں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مفاداتی
گروہ ان لوگوں کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے جو عام حالات

میں ان کی ہمنوائی کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے نمائندے اپنے ان وعدوں پر قائم رہے جو انھوں نے عوام سے کئے تھے یا انھوں نے ایسا رویہ اختیار کیا جس کے بارے میں ان کو یقین تھا کہ ان کے انتخابی حلقوں کے رائے دہندگان پسند کریں گے۔ اگر ہم مفاد پسند گروہوں کے ان اثرات کو نظر انداز کر دیں تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ قانون سازی پر ان گروہوں کا کیا اثر ہے؟ بدقسمتی سے اس مسئلہ پر بہت کم تحقیق کی گئی ہے۔ بہرحال اس بارے میں جو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ایسے سیاست دانوں کے ذریعے پہنچتی ہیں جو عموماً حقیقت پسند اور مصلحت اندیش ہوتے ہیں۔ وہ مفاداتی گروہ جو کسی ایک مسئلہ سے وابستہ ہوں یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ اُن کے ارکان کی بہت بڑی اکثریت اس بات سے یقیناً دلچسپی کا اظہار کرے گی کہ اس مسئلہ پر کانگریس کے ارکان کس طرح ووٹ دیتے ہیں؛ اور اس پر کس حد تک کانگریس کے ممبران کو آمادہ کیا جا سکتا ہے، ایسا مفاداتی گروہ یہ اُمید کر سکتا ہے کہ اس کی بات سنی جائے گی اور کچھ لوگ اس کی حمایت بھی کریں گے۔ اس قسم کے گروپ گنتی کے ہوتے ہیں مثلاً نیگرو باشندوں کی فلاح و بہبود کی انجمن ہے، لیکن یہ گروہ بھی، جس کی سرگرمیاں شہری حقوق کے مسائل تک محدود ہیں اور جو ہر طرح نیگرو باشندوں کے مفادات کا حامی ہے، وہ انتخابات کے طریقہ کار اور نیگرو کے مخالف گروہوں پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکتا۔

مفاداتی گروہ کے قائدین کسی ایک ایسے مسئلہ یا چند مسائل سے جو ابتدا میں ان کی تنظیم کا باعث ہوئے، جتنا دور ہٹتے جائیں گے اسی نسبت سے عوامی عہدیداروں کے خیالات پر ان کا اثر بھی کم ہوتا چلا جائے گا۔ جان ایل، لوئس (John L. Lewis) کا معاملہ اس کی ایک بہت اچھی اور کلاسیکی مثال ہے۔ لوئس کو یونین کے قائد کی حیثیت سے کان کنی کے مزدوروں کی انجمن کی پوری وفاداری اور حمایت حاصل تھی۔ اس تنظیم کے ارکان اس کی اپیل پر ہڑتال کر دیتے تھے کیونکہ وہ اس مسئلہ کو سمجھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ اس کی قیادت عام طور سے کامیاب رہی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں فرینکلن ڈی۔ روزویلٹ کے دوبارہ صدر منتخب کئے جانے کے خلاف لوئس نے مزدور انجمنوں کو اکسایا، تو تمام ارکان خود لوئس کے خلاف ہو گئے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس انتخاب میں لوئس کے انتخابی حلقے میں جہاں کان کنی مزدوروں کی اکثریت ہے روزویلٹ کو پانوے فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔

مفاداتی گروہوں کے ضوابط

اثر اندازی کی کارروائیوں پر قانونی پابندی کا آغاز ۱۹ ویں صدی کے ابتدائی برسوں ہی میں ہو گیا تھا اور ریاست جارجیا کے دستور میں تحریر شدہ واحد سطر کہ 'اثر اندازی (Lobbying) کی کوشش جرم ہے' اس کی محرک ہوئی۔ دوسری وفاقی ریاستوں اور قومی حکومت نے بھی اس کی تقلید کی۔ رشوت ستانی کو ہمیشہ روکا گیا

ہے، لیکن حالیہ برسوں میں اس سے متعلق اہم قوانین کی نوعیت بدل گئی ہے کیونکہ امریکی سیاست کے سارے منظر میں اب اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا ہے۔

۱۹۴۶ء کے قانون نیشنل لابیئنگ ایکٹ کے مطابق وہ گروہ اور افراد جو سرکاری فیصلوں پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں، ان کو چاہئے کہ سینٹ اور ایوان نمائندگان کے کلرکوں کے پاس اپنے اندراجات کرائیں اور پابندی سے تفصیلات بھیجتے رہیں اس رپورٹ میں ان تمام افراد اور اداروں کی فہرست ہونا چاہئے جو کسی گروہ کو پانچ سو ڈالر سے زائد چندہ دیتے ہیں اور ایسے افراد کی فہرست بھی جو کسی مفاداتی گروہ سے اس ڈالر کی رقم بھی حاصل کرتے ہوں یہ معلومات کانگریس کی کمیٹیوں اور عوام کو فراہم کی جاتی ہیں۔

کانگریس نے ۱۹۶۴ء کے ایکٹ پر عمل درآمد کے بارے میں اس خیال سے چھان بین کی تھی کہ ضوابط میں تبدیلی کی جائے۔ لیکن اب تک کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس پوری طرح اب اس نظریہ کی تائید کرتی ہے کہ ان مفاداتی گروہوں کی کارروائیوں کو کسی ضابطہ کا پابند بنانے کے سلسلے میں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ان کی سرگرمیوں اور اخراجات کی تشہیر کی جائے تاکہ لوگوں

---

۵ ابتک سب سے مفصل تحقیقات ایوان نمائندگان کی ایک کمیٹی نے کانگریس کے رکن آنجہانی فرینک کشا ن کی صدارت میں کی ہے۔ اپنی رپورٹ میں اس کمیٹی نے معمولی تبدیلیوں کی سفارش کی ہے۔

کو یہ دیکھنے کا موقع ملے کہ یہ گروہ "دل" مقصد کی خاطر کس قدر رقم خرچ کرتے ہیں ان کی سرگرمیاں کیا ہیں اور ان کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں۔

مفاداتی گروہوں کے بارے میں ریاستی ضوابط اور قومی ضوابط کی نوعیت یکساں ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی ضابطہ موجود ہے، ریاستی قوانین نے ان مفاداتی گروہوں کے افعال کو محدود کرنے یا ان پر تفصیلی پابندی کے بجائے ان کے افعال و اعمال کی اشاعت کو کافی سمجھا ہے

۵

امریکہ کا جماعتی نظام

سیاسی جماعتیں ہر جمہوری معاشرہ میں ہوتی ہیں، لیکن ان کی تنظیم اور طریقہ ہائے کار ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں، جن کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ایک بات جو تمام کامیاب جمہوری معاشروں میں مشترک ہوتی ہے، وہ ایک ایسا سیاسی انتظام ہے جو ووٹروں کو اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ سنجیدگی سے مقابلہ کرنے والے امیدواروں میں سے اپنی پسند کے مطابق انتخاب کر سکیں۔

کسی ملک میں سیاسی جماعتوں کی تعداد، لازمی طور پر مقابلہ کی نوعیت اور شدت کا اظہار نہیں کرتی۔ یہ ممکن ہے کہ کسی معاشرے میں جہاں یک جماعتی نظام سیاست پر غالب ہو وہاں جماعت کے اندر دھڑے بندیوں کی وجہ سے زوردار مقابلہ ہو اور عوام کو اپنی پسند کے اظہار کا نمایاں موقع مل سکے۔ دوسری طرف یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ ملک میں کئی سیاسی جماعتیں موجود ہوں مگر ان کے درمیان کوئی حقیقی مقابلہ نہ ہو۔ اشتراکی چین اور دوسرے

طفیلی اشتراکی ملکوں میں ایسے مرحلے بھی آئے ہیں جب قومی قانون ساز اداروں میں کئی جماعتوں کو نمائندگی دی گئی۔ بدقسمتی سے اس نمائندگی کی کوئی جمہوری قدر و قیمت نہیں تھی کیونکہ کسی انتخابی ضلع میں نشست کے لئے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ملک کی اشتراکی قیادت مختلف شہروں میں جماعتوں کے نمائندوں کو منظوری دے دیتی تھی۔ اشتراکی قیادت نے کسی موقع پر بھی جماعتوں کے درمیان کھلے ہوئے مقابلہ کی اجازت نہیں دی۔ ایسا مقابلہ جو لوگوں کو اپنے حاکموں کے انتخاب میں شرکت کا موقع دیتا۔ یک جماعتی (اور آمرانہ) ملکوں کے عوام فیصلوں کے بعد ہی امور مملکت میں (فیصلوں کے مطابق) حصہ لیتے ہیں۔

اگر مختلف ملکوں کی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں تو یہی بات ایک ہی ملک کی مختلف جماعتوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو وقتاً فوقتاً تغیر و تبدل سے گزرتی ہیں۔ کسی معاشرہ کی جماعتوں اور اسکے قوانین و آئین کے درمیان باہم دگر تقابل کا سلسلہ جاری رہتا ہے ہمیں نئی جمہوریتوں کی نسبت قدیم جمہوریتوں میں جماعتی طریقہ کار، جماعت اور ملک کے بنیادی قوانین کے تعلق میں تبدیلیاں اکثر و بیشتر مل جائیں گی۔

برطانیہ عظمیٰ اور امریکہ جیسی پرانی جمہوریتوں میں سیاسی جماعتیں آئین یا جماعتوں کے قوانین کی منظوری کے بغیر وجود میں آئی ہیں۔ ان کی ترقی کا سبب یہ تھا کہ دستور آزادانہ انتخاب کا موقع دیتا ہے اور آزادانہ انتخابات، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، سیاسی جماعتوں کے

وجود کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں جو عوام کی منظوری کیلئے متبادل
پالیسیوں اور امیدواروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو ان
کے قیام کے کتنے ہی سال بعد قانون نے باضابطہ طور پر تسلیم کیا۔ یہ قوانین
جماعتی تنظیم کے لئے طریق کار اور حصول اقتدار کے لئے اصول و قواعد
کی وضاحت کرتے ہیں جن کے تحت یہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں
انتخابات لڑتی ہیں اور ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہیں۔ عام طور پر
جو قوانین جماعتوں کی کارکردگی کے لئے بنائے گئے ہیں انھوں نے
جماعتوں کو بڑی آزادی دے رکھی ہے کہ وہ اپنے داخلی انتظام کو
جس طرح چاہیں چلائیں۔ اس باب میں امریکہ کے بعض علاقے قدیم
جمہوری علاقوں سے مختلف ہیں کیونکہ یہاں ریاستوں میں سے بعض
نے تنظیموں کے ضابطے بھی وضع کئے ہیں اور جماعتوں کی نامزدگی
کے طریق کار بھی بڑی تفصیل کے ساتھ مرتب کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں
یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جو ریاستیں اپنی جماعتوں
کے آئین و ضوابط پر زیادہ اختیار رکھتی ہیں، کم و بیش بلا استثنے
کے وہ ریاستیں ہیں جو بعد میں بسیں اور اولین امریکی جماعتوں کی تشکیل
اور مرکزی حکومت کے قیام کے کوئی پچاس سال بعد یونین میں شامل ہوئیں

سیاسی جماعتیں۔ پارلیمانی اور صدارتی نظام میں

جب ہم زیادہ تفصیل سے
ساتھ امریکہ کے جماعتی نظام کا ذکر کریں گے اب وقت ہم اس نظام کی

ان چند خصوصیات کا بھی تذکرہ کریں گے جو دوسرے ملکوں کے جماعتی نظام میں نہیں ملتیں۔ اس وقت ہم اس بات کی وضاحت بھی کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان خصوصیات و خصائص کی تخلیق میں کون سے عناصر شامل ہیں۔ جمہوری ملکوں کی اکثریت میں پارلیمانی نظام رائج ہے اسی لئے اس موقع پر ان نمایاں اختلافات کے متعلق کچھ کہہ دینا مناسب ہوگا جو پارلیمانی نظام اور امریکہ کے صدارتی نظام کے تحت سیاسی جماعتوں میں پائے جاتے ہیں۔

پارلیمانی نظاموں کے سیاسی اور انتخابی انتظامات میں کئی مشترک خصوصیات ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان انتظامات کی تفصیلات مختلف پارلیمانی جمہوریتوں میں جداگانہ ہوتی ہیں۔ عمومی طور پر ہم تمام پارلیمانی حکومتوں میں ذیل کی خصوصیات کی توقع کرسکتے ہیں۔

۱۔ پارلیمان کی ایک مقررہ مدت جس میں انتہائی ہنگامی اور بحرانی حالات کے علاوہ توسیع نہیں کی جاسکتی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پارلیمان کی مدت کے اختتام سے پہلے اس کی برطرفی کا امکان بھی رہتا ہے۔

۲۔ ایک کابینہ یا پارلیمان کی مجلس انتظامیہ جسے پارلیمان کے ارکان کی اکثریت منتخب کرتی ہے، اور جو کم سے کم نظریاتی حد تک اکثریت کی رضامندی کے تحت کام کرتی ہے۔

۳۔ کابینہ یا مجلس انتظامیہ کے ارکان قوانین کے نفاذ اور امور

خارجہ اور فوجی انتظامات کے لئے برابر کے ذمہ دار ہوتے ہیں (ان کی ذمہ داری اجتماعی ہوتی ہے)۔

۴۔ ایک عہدہ جو سیاسی شعبہ سے علیحدہ (اور بالاتر) ہوتا ہے اور جس کا حامل سربراہِ مملکت کے فرائض انجام دیتا ہے اور اپنے منصب کے لحاظ سے اپنے عوام کی وحدت کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ عہدیدار رسمی تقریبات کے موقع پر قوم کی نمائندگی کرتا ہے۔ علاوہ بریں وہ رسمی طور پر پارلیمان کی مدت کے اختتام پر اس کے برطرف کرتا ہے اور نئی پارلیمان کے انتخابات کا اعلان کرتا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں وہ اپنے اختیار تمیزی کو استعمال نہیں کرتا ہے بلکہ وزیر اعظم کی درخواست کو دہرا دیتا ہے۔ بہرحال جب کابینہ اور وزیر اعظم کو انتخاب کے بعد نئی پارلیمان کی کابینہ کے لئے جگہ خالی کرنی ہوتی ہے یا نئے انتخاب کی درخواست کرنی ہوتی ہے تو وہ اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

وہ جماعتی نظام جو ایسے انتظامات کے تحت پروان چڑھے گا یقینی اور بڑی حد تک مرکزی ہوگا۔ پارلیمان میں قائدین جماعت اور ان کے متبعین اندیشوں کی وجہ سے متحد رہتے ہیں۔ دونوں (قائدین اور متبعین) کو یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اگر وہ ایک ساتھ ووٹ نہ دیں تو اپنے عہدوں سے محروم ہو جائیں گے۔ اور یوں نئے انتخابات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جماعتی رہنما اگرچہ جماعتی اقتدار کے رتبہ اور منصب سے ہٹائے جا سکتے ہیں، لیکن (عام حالات میں) جماعت کے فیصلوں پر ان کا بڑا

اثر ہوتا ہے کیونکہ قیادت ہی برطرفی اور انتخابات کا مطالبہ کر سکتی ہے۔
عام طور پر جماعتیں (اہم مسائل پر) پہلے آپس ہی میں فیصلے کر لیتی ہیں
اور اس کے بعد ایک مخصوص جماعت کے رکن پارلیمان کی سرکاری
رائے شماری میں متحد ہو کر ووٹ دیتے ہیں۔ کابینہ میں جماعت کے ارکان
(کابینہ خود بھی پارلیمان کا ایک حصہ ہے) اور جماعت کے پیرو بہت
کم کھلم کھلا اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں۔

بصورت حال صدارتی نظام میں، کم سے کم جس طرح امریکہ میں عمل
ہو رہا ہے، وہ بہت مختلف ہے۔ یہاں پارلیمانی نظام کے برخلاف
مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں۔

(۱) کانگریس کے دونوں ایوانوں کے ارکان کی مدت متعین ہے
اور دونوں ایوانوں میں سے کوئی بھی اس مقررہ مدت کی تکمیل سے
پہلے نہ تو اپنے آپ کو برخاست کر سکتا ہے اور نہ صدر کا کوئی حکم اس میعاد
میں تخفیف کر سکتا ہے۔

(۲) صدر کا انتخاب عوام چار سال کی مدت کے لئے کرتے ہیں (اور
اس انتخاب کا کانگریس کے انتخاب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا)۔ کانگریس
میں خواہ کسی جماعت کو اکثریت حاصل ہو، صدر مدت معینہ تک اپنے
عہدہ پر فائز رہے گا۔

(۳) پالیسی سے متعلق فیصلوں میں صدر یا کانگریس باضابطہ طور پر
ایک دوسرے کے لئے ذمہ دار نہیں ہیں، اگرچہ صدر وضع قوانین میں حصہ

لیتا ہے اور کانگریس انتظامی امور ہیں۔

(۴) صدارت ایک ہی شخص میں، مملکت کی سربراہی کے فرائض اور انتظامی امور کی نگرانی کو مجتمع کر دیتی ہے۔ اسی لئے صدر بیک وقت اتحاد کے نشان، سیاسی فریق اور قانون کے نافذ کرنے والے کا درجہ اور حیثیت رکھتا ہے۔

صدارتی نظام کے تحت جماعتی اتحاد کے لئے بہت کم قوت محرکہ ہوتی ہے۔ کسی مخصوص مسئلہ پر اگر صدر یا کانگریس عوامی رائے عامہ کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام ہو جائے، تو اس سے دوسرے کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ کانگریس میں جماعت کے ارکان کے لئے ایک معمولی سی دھمکی کے طور پر بھی برطرفی کی قوت موجود نہیں ہے کیونکہ یہاں برطرفی کا سوال ہی نہیں ہے۔ صدر اپنی جماعت کا قائد ہوتا ہے لیکن وہ دوسرے اراکین پر اپنی خواہش منوانے کے لئے دباؤ ڈالنے کی قوت بھی نہیں رکھتا ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ ارکان حکومت کی انتظامیہ میں کسی تقرری منصب پر فائز ہوں۔

امریکی جماعتی نظام کی خصوصیات

ریاستہائے متحدہ میں جماعتی نظام کی چار خصوصیات باہم رشتہ اور ایک دوسرے سے متعلق ہیں لیکن ان کی اہمیت کے پیش نظر ہر ایک پر جداگانہ بحث کی ضرورت ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دو جماعتی نظام ہے۔ امریکی قوم کی

تاریخ میں دوسری جماعتیں کبھی اُبھرتی رہی ہیں لیکن کوئی تیسری جماعت دونوں اکثریتی جماعتوں میں سے کسی کے لئے بھی چار سال سے زیادہ مدت کے لئے خطرہ کا باعث نہیں رہی ہے۔ ہر انتخاب میں چھ یا اس سے بھی زیادہ جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ۱۹۲۴ء سے اب تک ہر انتخاب میں چھوٹی دونوں میں سے کم از کم ۹۵ فیصد ووٹ ری پبلکن اور ڈیموکریٹک جماعتوں میں ڈالے گئے ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امریکہ کی جماعتیں لامرکزی یا کثیرالمراکزی (Multi Centered) ہیں۔ دونوں سیاسی جماعتوں میں سے کسی پر بھی کنٹرول واشنگٹن یا کسی دوسری جگہ مرتکز نہیں ہو سکا۔ ہر چار سال میں ایک بار ان جماعتوں کے سب سے بڑے ترجمان یعنی قومی اجتماعات صدر اور نائب صدر کی نامزدگی اور منشور کی تحریر کے لئے منعقد ہوتے ہیں۔ یہ سیاسی منشور جماعتوں کے صدارتی بازو کے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتے ہیں لیکن یہ بات ضروری نہیں کہ ان منشوروں میں کانگریس کے ارکان کے نقطۂ نظر کی بھی نمائندگی ہو۔ دو اجتماعات کی درمیانی مدت میں اقتدار کا کوئی ایسا مرکز نہیں ہوتا جسے جماعت کے تمام حصے تسلیم کر لیں۔

تیسری خصوصیت کا جماعتوں کی لامرکزیت سے گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ امریکی جماعتیں ان معنوں میں غیر منظم ہیں کہ ان کا کوئی

عہدہ دار یا سرکاری ترجمان پالیسی امور پر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتا جس کی پابندی جماعت کے تمام ارکان کے لئے لازمی ہو۔ صدر قانون سازی کے سلسلہ میں کانگریس کو تجویز پیش کر سکتا ہے لیکن اس کی جماعت کے کچھ ممبر بھی یقینی طور پر کانگریس کے ان ارکان میں شامل ہوں گے جو اس کی تجویز کے خلاف رائے دیں گے۔ کانگریس کے جماعتی قائدین کی بھی یہ حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جماعت کے دوسرے ارکان کو اپنے فیصلہ کی پابندی پر مجبور کر سکیں۔

چوتھی خصوصیت جو غالباً دوسری اور تیسری خصوصیت کے سلسلہ میں واضح ہو چکی ہے، یہ ہے کہ امریکہ کی جماعتیں غیر نظریاتی ہیں دونوں جماعتوں نے جمہوری نظام کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے لیکن اس پابندی اور ذمہ داری کے باوجود ہر جماعت کے ارکان ان فیصلہ کن اور اہم مسائل پر بھی آپس میں اختلاف رکھتے ہیں جو انہیں آج در پیش ہیں۔ کچھ ڈیموکریٹ اور ری پبلکن ارکان معاشی نظام پر حکومت کے زیادہ انضباط کے حق میں ہیں۔ ڈیموکریٹک اور ری پبلکن جماعتوں کے بہت سے ارکان معاشی شعبۂ زندگی میں حکومت کی دخل اندازی کی توسیع کی مخالفت کرتے ہیں۔ دونوں جماعتوں میں ایسے افراد ہیں جو بین الاقوامی معاملات میں امریکی قوم کی کوششوں میں اضافہ چاہتے ہیں یا ان کوششوں کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں جماعتیں اپنے منتخب شدہ ارکان سے کسی بے لوچ اور سنگین نظریاتی وحدت اور وابستگی کا مطالبہ نہیں

کر سکتیں کیونکہ یہ جماعتیں بحرِ اوقیانوس سے بحرالکاہل تک کھیلے ہوئے ملک میں زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے ان افراد کی نمائندگی کرتی ہیں جو کتنے ہی نسلی اور تہذیبی پس منظر اور روایات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جماعتی نظریہ کے فقدان کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں جماعتوں میں کوئی اختلاف نہیں یا صدارت اور کانگریس کی نشستوں کے لئے مقابلے محض نمائشی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے "رائے عامہ" کے باب میں کہا ہر خاص گروہ کے اراکین زیادہ بڑی تعداد میں ایک جماعت کی نسبت دوسری جماعت سے وابستہ ہو جاتے ہیں برطانیہ کے مشہور ماہرِ سیاست ڈیوڈ بٹلر نے یہ استدلال (پیشینگوئی) کیا ہے کہ ری پبلکن اور ڈیموکریٹک صدارتی اُمیدواروں کے درمیان ووٹروں کا انتخاب امریکہ کے مستقبل کو اس سے کہیں زیادہ متاثر کرتا ہے جتنا مزدور اور قدامت پسند جماعتوں کے درمیان برطانوی رائے دہندگان کا انتخاب برطانیہ کو متاثر کرتا ہے۔

امریکہ کے جماعتی نظام کے چاروں عناصر پر ایک ساتھ غور کرنا ضروری ہے کیونکہ ان سب کی موجودگی ہی اس نظام اور اس کی انفرادیت کی تشکیل کرتی ہے پھر یہ بھی بہتر ہوگا کہ چند صفحوں میں یہ وضاحت کر دی جائے کہ ہر ایک (خصوصیت) یہاں کے سیاسی نظام کا جزو لازم کیوں ہے اور پھر اس حکومت کی نوعیت سے متعلق چند باتیں کہی جائیں جو ان چاروں کے اشتراک اور باہم آمیزگی سے وجود میں آتی ہیں۔

دو جماعتی نظام

دونوں جماعتوں کی پیچیدگی ریاستہائے متحدہ میں نام نہاد "زمانۂ خیر سگالی" کے اختتام سے دو مقتدر جماعتیں ہیں جب کہ ۱۸۲۴ء میں تھامس جیفرسن (Thomas Jefferson) کی قائم کی ہوئی ڈیموکریٹک ری پبلکن" جماعت ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد سے ایسے ادوار بھی آئے ہیں جب تیسری جماعتیں نمودار ہوئیں، معمولی کردار ادا کرنے کیلئے بڑی جماعتوں کی حمایت کی گئی اور وقت کے اہم مسئلہ پر ان کی حیثیت مضبوط کرنے کے لئے۔ لیکن اس کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہیں ان کی جگہ دوسری جماعتیں لے لیتی ہیں۔ اور وہ بھی اپنی باری پر گوشہ گمنامی میں چلی جاتی ہیں۔ تمام چھوٹی جماعتوں میں سے صرف ری پبلکن جماعت باقی رہ گئی۔ وگ (Whig) جماعت کی جگہ لینے سے قبل، جو ۱۸۵۶ء سے پہلے بڑی جماعتوں میں سے ایک تھی، ری پبلکن جماعت تیسری جماعت تھی۔

۱۸۶۰ء میں جبکہ ملک خانہ جنگی میں مبتلا تھا، چار جماعتیں صدارت کے لئے کوشاں تھیں۔ چار میں سے دو جماعتیں قلعہ سمٹر (Fort Sumter) پر گولہ باری کے ساتھ ہی غائب ہو گئی ہیں۔ جو فوجی ظلم و تشدد کے آغاز

کی علامت تھی۔ اور پھر ری پبلکن اور ڈیموکریٹک جماعتیں ہی سیاسی اکھاڑہ میں رہ گئیں۔

ایک صدی سے زیادہ وقت گزر گیا جبکہ خانہ جنگی شروع ہوئی تھی اس عرصہ میں ری پبلکن اور ڈیموکریٹک جماعتوں کے علاوہ صرف چار جماعتوں نے بعض ریاستوں (کم سے کم کسی ایک ریاست) میں اپنے صدارتی امیدواروں کے لئے اکثریت حاصل کی۔ پاپولیسٹ (جماعت) (Populists) نے ۱۸۹۲ء میں، پروگریسیو (جماعت) (Progressive) نے سابق صدر تھیوڈور روز ویلٹ (Thevdore Roosevelt) کے تحت ۱۹۱۲ء میں، رابرٹ ایم۔ لافولیٹ (Robert M-La Follette) کی پروگریسیو جماعت نے ۱۹۲۴ء میں، اور "ریاستی حقوق کی جماعت" (States Rights Party) نے ۱۹۴۸ء میں۔ ہر ایک نے ایک یا ایک سے زیادہ ریاستوں میں کسی نہ کسی انتخاب میں اکثریت حاصل کی۔ ان جماعتوں میں سے صرف پاپولسٹ (Papulists) جماعت ہی صحیح معنوں میں ایک نئی جماعت تھی۔ باقی تین جماعتیں دو بڑی جماعتوں میں سے ایک کے وقتی مخالف گروہ کا درجہ رکھتی تھیں۔ تینوں میں سے کسی نے بھی کانگریس کی نشستوں کے لئے بڑی جماعتوں کا سنجیدگی سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے صرف صدارت حاصل کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہنے کے بعد بڑی

جماعتوں کی طرف لوٹ گئے جن سے حقیقتاً وہ الگ ہوئے تھے۔

پاپولسٹ (جماعت) نے کسانوں، چھوٹے تاجروں، وسط مغرب اور بڑی میدانی ریاستوں کے بعض مزدوروں کے انقلاب کی نمائندگی کی۔ انھوں نے اپنی تنظیم کی کیونکہ بڑی جماعتوں کا ریلوے اور مشرق کے بڑے مالی اور صنعتی مفادات سے مضبوط رشتہ تھا۔ پاپولسٹ جماعت (Populists) نے ریاستی و مقامی سطح پر ۱۸۸۰ء کے آخر میں اپنی تنظیم کی۔ ۱۸۹۲ء کی صدارتی دوڑ میں اپنا بھی ایک امیدوار شامل کر دیا۔ پاپولیسٹ امیدوار کو چار ریاستوں میں اکثریت حاصل رہی اور اس نے مجموعی طور پر ۲۲ انتخابی (Electoral Votes) ووٹ حاصل کئے۔ اس سے دونوں بڑی جماعتوں کو حکومت بنانے میں بڑا اندیشہ نظر آرہا تھا لیکن یہ جماعت ۱۸۹۶ء میں ختم ہوگئی جب ڈیموکریٹک جماعت نے ولیم جیننگ برائن (William Jening Bryn) کو صدارت کے لئے نامزد کیا۔ اس کی آواز میں بھی مشرق کے معاشی مفادات کے خلاف بے اعتمادی کی بازگشت تھی جس نے پاپولیسٹس کو پریشان کر رکھا تھا۔

برائن کی نامزدگی کے کچھ عرصہ کے بعد پاپولسٹ جماعت نے اپنے اجتماع میں صدارت کے لئے اس کی نامزدگی تائید کی اور نائب صدارت کے لئے اپنے ارکان میں سے ایک کو نامزد کیا۔ برائن کو انتخابات میں شکست ہوئی، لیکن اسے ڈیموکریٹک جماعت کے

ساٹھ لاکھ سے زیادہ ووٹ ملے اور کم و بیش ڈھائی لاکھ پاپولسٹ ووٹ مل گئے۔ پاپولسٹ جماعت یوں ہی کسمپرسی کی حالت میں سولہ سال تک قائم رہی یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں اُسے باضابطہ طور پر توڑ دیا گیا۔

چھوٹی مارکسی جماعتیں

انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے اب تک مارکسی بُنیاد رکھنے والی جماعتوں نے ہر انتخاب میں امریکی ووٹروں کے سامنے اپنے امیدوار پیش کئے ہیں، لیکن اُن میں سے کوئی بھی قومی یا ریاستی اقتدار کے لئے سنجیدہ اور قابلِ ذکر مقابلہ کرنے والا ثابت نہیں ہوا۔ مارکسی جماعتوں میں سب سے بااثر سوشلسٹ پارٹی تھی جس نے ۱۹۱۲ء کے صدارتی انتخاب میں کم و بیش ۶ فیصد اور ۱۹۲۰ء کی انتخابی مہم میں ۳ فی صد سے کچھ زیادہ ووٹ حاصل کئے۔ اس جماعت کے عہدِ عروج میں کئی سوشلسٹ کانگریس کے رُکن منتخب ہوئے اور چند شہروں میں اس جماعت کے ارکان رئیس بلدہ (میئر) چُنے گئے۔ ماضی قریب میں سوشلسٹ پارٹی کی رُکنیت اور عوامی مقبولیت اس حد تک گھٹ گئی کہ اب وہ قومی عہدوں کے لئے اپنے اُمیدوار بھی نامزد نہیں کرتی۔

اشتراکی جماعت (کمیونسٹ پارٹی) کی رکنیت کبھی زیادہ نہیں رہی اگرچہ اس جماعت نے ۱۹۳۶ء میں ایک لاکھ سے زیادہ ووٹ حاصل کر لئے۔ اشتراکی جماعت کا کوئی رُکن کبھی مقامی سطح سے اُوپر کسی

(ریاستی یا قومی) عہدہ کے لیے منتخب نہیں ہوا اور مقامی عہدوں کی حد
تک بھی اشتراکیوں کی کامیابی نیویارک شہر تک محدود رہی ہے۔
اشتراکی جماعت کی اعلان کردہ رکنیت اب پانچ ہزار سے بھی کم ہے
لیکن دوسرے ممالک کی طرح (امریکہ میں بھی) تعداد رکنیت، اشتراکیوں
کی قوت کے اندازہ کا واحد یا سب سے اہم پیمانہ نہیں ہے۔ بعض
ٹریڈ یونینوں پر اشتراکی جماعت کا اقتدار اور قبضہ اس کی قوت کا
راز رہا ہے۔ اس غلبہ کے ذریعہ مزدوروں کی جماعت سے احتجاج
بھی کرائے گئے ہیں اور تغیر و تبدیلی کے قدرے پوشیدہ کام بھی۔
لیکن ان دونوں میدانوں میں اشتراکی جماعت کی قوت ۱۹۴۵ء سے
کم ہوتی گئی ہے جب روس نے سرد جنگ کا آغاز کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء کے
موسم گرما میں کوریا پر اشتراکی حملہ ۱۹۵۶ء میں بیسویں اشتراکی کانگریس
منعقدہ ماسکو میں اسٹالن کے عہد کی نوعیت کے بارے میں وحشت
کے انکشافات، اسی سال ہنگری کے محبان وطن پر آزادی کو
کچلنے میں روس کی وحشت و بربریت اور ایٹمی اسلحہ بندی کے سلسلہ
میں سنجیدہ گفت و شنید میں خروشچیف کی ناکامی ... ان سب باتوں
نے مل کر امریکہ میں اشتراکی جماعت کو اپنی حمایت سے بڑی حد تک
محروم کر دیا۔ اگر بین الاقوامی حالات میں کوئی غیر معمولی تبدیلی (جس کی
پیشنگوئی نہ کی جا سکے) رونما نہ ہوئی تو اشتراکی جماعت کی رکنیت
گھٹتی رہے گی، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس جماعت کے زیر تسلط جماعتو

کے ذریعہ اس کی دہشت ناک قوت نباری رہے[1]۔

امریکہ میں دو جماعتی نظام کیوں؟

نہایت واضح طور پر دو جماعتی نظام ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعہ امریکی عوام اپنے سیاسی معاملات و مسائل کا انتظام اور انصرام چاہتے ہیں لیکن یہ بات اتنی واضح نہیں ہے کہ کثیر الجماعتی نظام کی جگہ یہاں دو جماعتی نظام ہی نے کیوں ترقی پائی ہے۔

کچھ لوگوں کی رائے میں دو جماعتی نظام کی ترقی ناگزیر تھی کیونکہ سب سے بڑا اور واحد سیاسی انعام "صدارت" تھا۔ سیاست دانوں نے اپنے آپ کو (اور اس مسئلہ کو) دو ایسے امیدواروں تک محدود رکھنا پسند کیا جن میں سے ایک کو منتخب کیا جا سکے۔ انھوں نے اس طریقہ کار کو ایوان نمائندگان کے ہنگامی فیصلوں پر ترجیح دی۔ ایوان نمائندگان کو اُس صورت میں صدر کے انتخاب کا آئینی حق حاصل ہے جب کوئی امیدوار انتخابی ووٹوں کی اکثریت حاصل نہ کر سکے۔ بہرحال یہ بات واضح ہے کہ جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ رائے دہندگان کے لئے کم و بیش سب

---

[1] وہ لوگ جو امریکہ میں اشتراکی جماعت کی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں انہیں ذیل کی کتابوں میں اشتراکی جماعت کی سرگرمیوں اور تاریخ پر بہت اچھی بحث مل سکتی ہے۔ — امریکی اشتراکیت کی جڑیں از ڈریپر (نیویارک ۱۹۵۷ء)۔ امریکی اشتراکیت اور سوویت روس از ڈریپر (نیویارک ۱۹۶۰ء)۔ امریکی اشتراکیت کا زوال از ڈیوڈ اے۔ شینون (نیویارک ۱۹۵۹ء)۔ امریکی اشتراکی جماعت از ارونگ ہووا اور لوئیس کوسر (بوسٹن۔ ۱۹۵۷ء)

ہی ریاستوں میں قابل قبول متبادل تشکیلیں پیش کرنی پڑتی ہیں۔ اگر دونوں جماعتیں ایسے متبادل حل پیش کرنے میں ناکام ہو جائیں تو ایوان نمائندگان کے ہنگامی اور اتفاقی فیصلے آج بھی قابل ترجیح ہوں گے۔ شہری حقوق کے مسئلہ پر ۱۹۴۸ء میں ریاستی حقوق کی جماعت نے ڈیموکریٹک اور ریپبلکن حل کو اس درجہ ناقابل قبول سمجھا کہ اُس نے صدارتی مقابلہ میں اپنے امیدوار کو بھی شامل کر دیا۔ یہی بات ۱۸۹۲ء میں بھی درست تھی جب پاپولسٹ جماعت نے اپنے امیدوار کو صدر کے عہدہ کے لیے کھڑا کیا۔

دوسرے سیاسی مبصروں اور تجزیہ کرنے والوں نے دوجماعتی نظام کو یک رُکنی اضلاع کی روشنی میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر انہیں ضلعوں سے کانگریس کے رکن اور بیشتر ریاستی قانون ساز چنے جاتے ہیں۔ اس تجزیہ اور دلیل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یک رُکنی اضلاع سے کانگریس کے ارکان کے انتخاب سے پہلے بھی امریکہ کے سیاسی منظر پر دو سیاسی جماعتیں چھائی ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں جب بڑی سیاسی جماعتوں کے امیدوار رائے دہندگان کی خواہشوں اور توقعات کو پورا کرنے میں ناکام ہوئے تو بعض ریاستوں میں تیسری جماعتیں بھی عالم وجود میں آئیں اور ان جماعتوں کے ارکان نے کانگریس کے انتخابات میں حصہ بھی لیا۔

۱۹۰۰ء سے بلاواسطہ ابتدائی انتخابات نے کسی بھی ضلع میں بڑی

جماعتوں کے نامزد کردہ امیدواروں کے چناؤ کے سلسلہ میں عام ووٹر کے اثرات کو وسیع تر کر دیا ہے۔ کسی بھی جماعت کے ساتھ وابستہ ووٹروں کی اکثریت اس بات کا یقین کر سکتی ہے کہ ان کی جماعت کے امیدوار آزاد خیال ہوں یا رجعت پسند۔ اور جماعت کے نامزد امیدوار والے کے سلسلہ میں ووٹروں کے اس دائرہ اثر اور ان کی قوت نے واضح طور پر کسی تیسری جماعت (اور مزید جماعتوں) کی ضرورت کو گھٹا دیا ہے۔ بلاواسطہ ابتدائی انتخابات کے نظام کے ساتھ کانگریس کے انتخابی ضلعوں میں حصول اقتدار کے لئے انتخاب میں حصہ لینے والی تیسری جماعتوں" کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔

کچھ لوگ فرانس کے عالم سیاسیات ڈوورجر سے اتفاق کرتے ہیں جس نے دو جماعتی نظام کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "دو جماعتی نظام چیزوں اور مسائل کی نوعیت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے ..... دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ سیاسی پسند عموماً متبادل چیزوں کے درمیان پسند اور چناؤ کا روپ دھار لیتی ہے۔ جماعتی ثنویت کا وجود لازمی نہیں ہے، لیکن رجحانات کی ثنویت ضرور موجود رہتی ہے"۔ ان تجزیہ کرنے والوں کا طرز استدلال یہ ہے کہ امریکہ میں زیادہ تر مسائل جنہوں نے ملک کو تقسیم کیا ہے، عام طور پر وہی مسائل ہیں جنہوں نے عوام کی بڑی اکثریت کو دو کیمپوں اور سیاسی گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر امریکہ کا جماعتی نظام "چیزوں

کی نوعیت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے"

دونوں بڑی جماعتوں کی ترقی کے اصلی اور بنیادی اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، اب یہ نظام اس مضبوطی کے ساتھ قائم ہو چکا ہے کہ اس میں تبدیلی کی کسی توقع کی اس وقت تک گنجائش نہیں، جب تک ری پبلکن اور ڈیموکریٹک جماعتیں ووٹروں کو اس انتخاب کا موقع دیتی رہیں گی جو ان کی خواہشوں کو آسودہ رکھ سکے۔

دو جماعتی نظام کے عملی پہلو پر ایک گہری نظر | "دو جماعتی نظام عملی شکل میں"۔

اس سے مراد ایک ایسا قومی جماعتی نظام ہے جس میں دو بڑی جماعتیں صدارت اور کانگریس پر مکمل قبضہ کے لئے ایک دوسرے کا مقابلہ کریں۔ پہلی بات (صدارت) بہت واضح ہے لیکن جب ہم صورت حال کا گہرائی سے اور ذرا قریب سے مطالعہ کرتے ہیں تو دوسری بات (کانگریس پر قبضہ) دھندلی اور کہر میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ کانگریس دونوں جماعتوں کے نمائندوں سے تشکیل پاتی ہے لیکن ان نمائندوں میں سے سب ان اضلاع سے نہیں آتے جہاں دونوں جماعتیں مساویانہ طور پر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی ہیں۔

رینی اور کینڈل نے ریاستوں کی گروہ بندی یوں کی ہے (۱) دو جماعتی ریاستیں (۳) اعتدال پسند یک جماعتی ریاستیں اور (۳) یک جماعتی ریاستیں[۲]۔ ان دونوں نے ان ریاستوں کو دو

جماعتی گروہ میں شامل کیا ہے جن میں دونوں جماعتوں میں سے ہر ایک نے گزشتہ برسوں میں کئی انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو انھوں نے دو جماعتی ریاستوں کے گروہ میں ۲۶ ریاستوں کو شامل کیا ہے۔ یہ گروہ بندی ریاست ہائے متحدہ میں ہوائی اور الاسکا کے شمول سے پہلے کی گئی تھی۔ یہ ریاستیں جنوب کے استثنیٰ کے ساتھ سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

رینی[۵۱] اور کینڈل نے ان ریاستوں کو اعتدال پسند یک جماعتی ریاستوں کے گروہ میں شامل کیا ہے جن میں کسی ایک جماعت نے بیشتر انتخابات جیتے ہوں لیکن دوسری جماعت کو بھی ریاست سے ووٹوں میں سے اتنے ووٹ ملے ہوں کہ اسے ایک مضبوط اور حقیقی

---

۵۱ آسٹن رینی اور ول مور کینڈل کی کتاب "جمہوریت اور امریکی جماعتی نظام" (۱۹۵۶ء) صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۶۔ بعض ریاستوں کی گروہ بندی پر تنقید کی جا سکتی ہے مثلاً رہوڈ آئی لینڈ کو دو جماعتی ریاست قرار دیا گیا ہے کیونکہ مصنفین نے جس چالیس سال کی مدت کو اپنے اعداد و شمار کی بنیاد بنایا ہے اس میں ری پبلکنوں اور ڈیموکریٹوں نے اپنے عہدوں کے انتخاب میں کم و بیش ایک سی کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ پہلے بیس برسوں میں بڑی باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ ری پبلکنوں کو فتح حاصل ہوتی رہی اور بعد کے بیس برسوں میں ڈیموکریٹ ریاست کی سیاست پر چھائے رہے۔ بہت کم مواقع ایسے آئے جب (ایک ہی انتخاب میں) دونوں جماعتوں کا مقابلہ مساوی رہا۔ کچھ اور ریاستوں کی تاریخ بھی کم و بیش ایسی ہی ہے۔

حزب اختلاف قرار دیا جا سکے۔ الحقوب نے بارہ ریاستوں کو اس نوع کی ریاستیں قرار دیا ہے۔ ان میں سے دو جنوب میں ہیں اور دو جنوب کی سرحد پر۔ باقی (آٹھ) ریاستیں وہ ہیں جن میں دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک نے تمام (یا کم و بیش تمام) انتخابات میں فتح حاصل کی ہو اور دوسری جماعت کو مجموعی ووٹوں کا نہایت کم حصہ ملا ہو۔ ایسی دس ریاستیں ہیں جن میں سے نو جنوب میں ہیں۔ ان جنوبی ریاستوں میں گزشتہ صدی کے بڑے حصہ میں ڈیموکریٹوں کو بالادستی اور غلبہ حاصل رہا ہے۔ باقی ماندہ ایک جماعتی ریاست ورمانٹ ہے جو ری پبلکن غلبہ اور بالادستی کا مرکز رہی ہے۔

رینی اور کنڈل کے اس تجزیہ کے بعد کے برسوں میں کئی یک جماعتی ریاستیں، دو جماعتی گروہ سے قریب تر آگئی ہیں۔ مثال کے طور پر ٹیکساس، ورجینیا اور فلوریڈا میں ڈیموکریٹوں کو آج بھی غلبہ حاصل ہے، لیکن ری پبلکن بھی پابندی کے ساتھ کانگریس کی کچھ نشستیں حاصل کرتے رہے ہیں اور صدارتی انتخابات میں ان ریاستوں میں یقینی طور پر مقابلہ سخت ہو گیا ہے۔

وی۔ او۔ کی نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ یک جماعتی ریاستوں میں جماعت کی نامزدگی کے لئے سخت مقابلہ ہوتا ہے اور اس کشمکش میں ووٹروں کو مقابلہ کرنے والوں میں سے کسی کو چننے کے سلسلہ میں اپنی پسند کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ اہم عہدوں کی

نامزدگی کے لیے چھ چھ آدمیوں کا باہمی مقابلہ عام سی بات ہے۔ کی (Key) کی تحقیقات کے مطابق ۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۴ء تک جنوب میں تقریباً ۶۲ فیصد ابتدائی انتخابات میں (جن میں سینٹ کا کوئی رکن شامل نہ تھا) جیتنے والے کو مجموعی ووٹوں میں سے ۶۰ فی صد سے کم ملے۔ دس فی صد انتخابات میں جیتنے والے کو ۹۰ فی صد تک ووٹ حاصل ہوئے۔ دوسرے الفاظ میں ایک جماعتی جنوبی ریاستوں میں سینٹ کی نامزدگی کے امیدواروں کی جماعت کے اندر ہی کم و بیش اتنی ہی مخالفت ہوتی جتنی دوسری جماعت کی موجودگی میں ہو سکتی تھی۔

امریکی جماعتوں کی لامرکزیت

ایک ایسی مخروطی شکل یا مخروطی مینار کا بنانا ممکن ہے جو دونوں بڑی جماعتوں کے سلسلۂ مدارج کا خاکہ پیش کر سکے۔ اس مینار کی بنیاد ہزاروں مقامی اور وارڈ تنظیمیں ہوں گی۔ ان کے بعد شہری یا کاونٹی جماعتیں آئیں گی۔ ان کے بعد پچاس ریاستی جماعتی تنظیمیں ہیں۔ پھر دو قومی جماعتیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی سربراہی ایک قومی صدر اور ایک قومی کمیٹی کرتی ہے۔ لیکن امریکی جماعتی نظام میں حکم کا کوئی زنجیری سلسلہ نہیں ہے جو قومی کمیٹی سے مقامی بلکہ ریاستی جماعتوں ہی تک، پھیلا ہوا ہو۔ حیرتناک حد تک جماعت کی ہر سطح، اپنے اوپر کی سطح سے آزاد اور لاتعلق ہے۔ اس باب میں صرف مقامی اور وارڈ تنظیموں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عام طور پر ہمیشہ نہیں اشہری

ف۱ مخروطی مینار کی تمثیل کے پیش نظر سطح کی جگہ منزل بھی کہا جا سکتا ہے۔ مترجم

جماعت کی نگرانی اور ہدایت کے مطابق کام کرتی ہیں۔ قومی کمیٹیوں میں ہر ریاست کے نمائندے ہوتے ہیں جن کا انتخاب عام طور پر قومی اجتماعات کے بعد کرتے ہیں۔ ریاستی نمائندوں کو ریاستی جماعتیں چنتی ہیں اور یہ نمائندے انہیں کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ یوں قومی کمیٹی حقیقی معنوں میں پوری جماعت کے لئے فیصلہ کرنے والے ادارہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہر چوتھے سال قومی اجتماع کے لئے تاریخ اور مقام کا یقین، قومی کمیٹی کا سب سے اہم فیصلہ ہوتا ہے۔

اپنے آغاز ہی سے امریکہ کی بڑی سیاسی جماعتیں لامرکزی رہی ہیں۔ صدارتی انتخاب کے علاوہ تنظیمی طور پر ان جماعتوں کا رُخ ریاستوں اور مقامی علاقوں (اور اُن کے مسائل) کی طرف ہوتا ہے۔ اس مقامی غلبہ اور کنٹرول کے بنیادی اسباب یہ تھے۔ ریاستوں کا پہلے سے وجود، اس عہد کے اہم ترین مسائل میں سے کئی کی مقامی نوعیت، مقامی مسائل کو حل کرنے کے لئے مقامی افسروں کے عوامی انتخابات، اور وہ آئینی دفعات جن کی رُو سے انتخابات پر ریاستوں کو مکمل حق انضباط حاصل تھا۔

آئین کے مطابق ریاست کے عوام کو ایوان نمائندگان کے ارکان کے انتخاب اور ریاستی مجالس قانون ساز کو سینیٹ کے ارکان کے انتخاب کا حق دیا گیا۔ یہ انتظام مقامی تبدیلیوں کے ساتھ ۱۹۱۳ء کی سترہویں آئینی ترمیم تک جاری رہا۔ اس ترمیم نے ریاستوں

میں سینٹ کے ارکان کے انتخاب کو عوامی بنا دیا۔ صدر کو انتخاب کنندگان اپنی ریاستوں میں بالواسطہ منتخب کرتے تھے۔ ان انتخاب کنندگان کو مختلف ریاستوں میں "ریاستی مقننہ کی ہدایات" کے مطابق چنا جاتا تھا۔

کانگریس کو "ایوان نمائندگان کے انتخاب کے وقت، جگہ اور طریقہ کار کے ریاستی انتظامات کو بدلنے کا اختیار دیا گیا تھا"۔ کانگریس کو صدارتی انتخاب کنندگان کے چناؤ کے وقت اور دن کے تعین کا اختیار بھی دیا گیا۔ یہ انتخاب سارے ملک میں ایک ہی دن ہوتا تھا۔

عملی طریقہ کار اور آئینی ترمیمات نے ان دفعات میں سے بعض کو بدل دیا ہے لیکن پوری امریکی تاریخ کے دوران بڑی حد تک انتخابات پر ریاستوں کا کنٹرول رہا ہے۔ کانگریس نے قومی عہدیداروں کے انتخاب کے لئے دن مقرر کر دیا ہے اس نے فریب دہی اور بددیانتی کے خلاف قوانین وضع کر دیئے ہیں لیکن آج سے چند برس پہلے تک کانگریس نے ووٹنگ یا انتخابی طریقہ کار میں کبھی مداخلت نہیں کی تھی۔ حالیہ قانون سازی میں بھی، جس کا ذکر اس سے پہلے ایک باب میں ہو چکا ہے، کانگریس نے اپنے دائرہ عمل کو ووٹنگ تک محدود رکھا ہے۔ اور اس قانون کے ذریعہ کانگریس نے ایسے قانون بنائے ہیں جو مختلف ریاستوں کے شہریوں کے درمیان انتخاب دہندگی کی

زیادہ سے زیادہ برابری اور مساوات کی ضمانت ہیں۔
انتخابات پر ریاستوں کے اختیار اور کنٹرول سے جماعتوں کو ترقی ہوئی ہے جنہوں نے انتخابات کے ریاستی قوانین سے مطابقت پیدا کرلی ہے۔ جب جماعتوں کی تنظیم اور کارکردگی کو باقاعدہ اور باضابطہ بنانا ضروری ہو گیا تو ریاستی مجالس قانون ساز نے قوانین وضع کئے۔ ہر ریاست نے اس بات کی تعریف بیان کی اور وضاحت کی کہ اس کی حدود میں جماعت کی تشکیل کے عناصر کیا ہیں۔ قوانین کے تحت وہاں یا تو ریاست ہے یا مقامی جماعتیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ریاست قومی جماعتی تنظیموں کو نہیں چلا سکتی، البتہ ریاستی حکومت اس ریاست سے قومی اجتماعات کے لئے مندوبین کے طریقہ انتخاب تعین کر سکتی ہے۔

ریاستی جماعتیں عام طور پر اپنے قومی اجتماعات کے نامزد کردہ امیدواروں کو قبول کر لیتی ہیں لیکن انہیں شاید ہی کبھی ریاستی قانون میں اس کے لئے مجبور کیا گیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۸ء میں بعض جنوبی ریاستوں کے سرکاری امیدوار ڈیموکریٹک قومی اجتماع کے نامزد کردہ امیدوار ہیری ٹرومین اور البن برکلے نہیں تھے بلکہ اسٹرام تھرمنڈ اور فلیڈنگ ایل۔ رائٹ تھے۔ ۱۹۶۰ء میں ریاست مسی سی پی نے انتخاب کنندگان کی دو فہرستیں بیلٹ کے لئے پیش کیں جنہیں ڈیموکریٹک کا نام دیا گیا تھا۔ ایک فہرست انتخاب

کنندگان قومی اجتماع کے نامزد کردہ امیدوار جان ایف۔ کینیڈی کی حمایت کر رہی تھی اور ریاستی ڈیموکریٹوں کی دوسری فہرست سینیٹر کینیڈی کی حمایت کے لئے رضامند نہ تھی اور اس فہرست کے انتخاب کنندگان نے کسی امیدوار کی حمایت کا عہد نہیں کیا تھا۔ سی سی پی کے ووٹروں نے دوسری فہرست کے انتخاب کنندگان کو چن لیا اور ان لوگوں نے سینیٹر ہیری ایف بارڈ کی حمایت کی جنہیں صدارت کے لئے جماعت نے نامزد نہیں کیا تھا۔

۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۰ء میں ریاستی جماعتوں کا یہ عمل غیر معمولی تھا۔ ایک خلاف معمول عمل لیکن یہ بات یقیناً ریاستوں کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ سرکاری بیلٹ کی تیاری اور صدارتی انتخاب میں اپنی پسند کے اظہار کے وقت ایک ایسے امیدوار کو نامزد کریں جسے قومی اجتماعات نے نامزد نہ کیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں تقریباً ہر ریاست میں یہ غیر مناسب صورت حال موجود ہے کہ صدارتی امیدوار جو برائے نام اپنی جماعت کا سربراہ ہوتا ہے وہ ریاستی جماعت کو ری پبلکن یا ڈیموکریٹ کا نام استعمال کرنے سے منع نہیں کر سکتا اور دوسری طرف ریاستی ڈیموکریٹک جماعت یا ری پبلکن جماعت اسے اپنی جماعت کا قومی رہنما تسلیم کرنے سے انکار کر سکتی ہے۔

ریاستہائے متحدہ میں ریاستوں کی قانونی حیثیت سے قطع نظر ایسے کئی قومی تاریخی اسباب ہیں جن کی بنا پر جماعتوں کو لامرکزی

رہنا چاہیئے۔ آج سے ڈیڑھ صدی پہلے کے تمام اہم فیصلے ملک کے شہروں اور قصبوں میں کیئے گئے تھے، ملک کے دارالحکومت میں نہیں۔ جو لوگ سینٹ کے رکن منتخب کیئے جاتے تھے ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی ریاستوں کے عوام اور صنعتوں کی نمائندگی کریں گے۔ ایوان نمائندگان کے رکن پہلے مجموعی طور پر اپنی ریاست سے چُنے جاتے تھے۔ بعد میں وہ یک رُکنی انتخابی اضلاع سے چُنے جانے لگے (نہایت غیر معمولی حالات کے سوا)۔ تمام اراکین کے لئے یہ بات آئینی طور پر لازمی ہے کہ وہ جس ریاست سے چُنے جائیں، اس کے باشندے ہوں۔ قانونی طور پر یا رواج کے مطابق ایوان نمائندگان کے امیدوار کو اس ضلع کا باشندہ ہونا چاہیئے، جس سے وہ انتخاب لڑنا چاہتے ہوں۔ ان قوانین میں بھی بعض مستثنیات ہیں، لیکن وہ نمائندے جو اپنے انتخابی ضلع کے باشندے نہیں، ان کی تعداد ایوان نمائندگان کی مجموعی رکنیت کے ایک فیصد سے بھی کم ہوتی ہے۔

وہ جماعتیں جو آئین کی منظوری کے فوراً ہی بعد وجود میں آئیں بنیادی طور پر مقامی حیثیت رکھتی تھیں اور ثانوی طور پر ان کا تعلق صدارت سے تھا، جو اس عہد کی سیاست میں کوئی خاص اہمیت اور عظمت نہ رکھتی تھی۔ جیسے جیسے شہر وسیع تر ہوتے گئے، جماعتوں کے مقاصد کی سمت اور جہت مقامی ہوتی گئی۔ شہر کی انجمنیں مقامی مسائل کے پیش نظر وجود میں آئیں اور ان کی بنیاد، مقامی پروگرام اور

سرپرستی پر رکھی جاتی۔ جو جگہیں، منصب، اور نوکریاں جماعت کے وفاداروں کو دی جاسکتی تھیں، وہ شہروں ہی میں دستیاب ہوسکتی تھیں۔ واشنگٹن میں "قومی ملازمت" کے نظام میں بہت کم جگہیں تھیں اور یہ جگہیں اور عہدے بھی ایسے نہ تھے جن کی بنا پر ایک مضبوط قومی جماعت کی تشکیل کی جاسکتی۔ ایسی جماعت جس کا نظم و ضبط صدر یا جماعت کے صدارتی اور قانون ساز بازووں کے کسی قسم کے اتحادی ادارہ کے ہاتھوں میں ہوتا۔ جب ۱۸۴۰ء کے بعد منتقلین روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں امریکہ میں آئے تو شہری سیاسی جماعتوں ہی نے انہیں نئے معاشرہ کا حصہ بننے اور اس سے ہم آہنگ ہوجانے میں مدد دی ہے۔ شہری اداروں ہی نے اُن کے لئے ملازمتوں اور ملازمتی معاہدوں کا بندوبست کیا جب کبھی کساد بازاری نے لوگوں کو بے روزگاری میں مبتلا کیا تو مقامی سیاسی تنظیم ہی نے انھیں سہارا دیا۔ اور یہ بات تو نہایت واضح ہے کہ رائے دہندگان انھیں مقامی جماعتوں اور تنظیموں کی طرف جھکتے چلے گئے۔

لوگوں کے نقاط نظر نے جماعتوں کی اس مقامیت کو ایک ٹھوس نظریاتی بنیاد عطا کردی۔ یہ لوگ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ "سب سے اچھی حکومت وہ ہے جو سب سے کم دبائے اور کم سے کم اطاعت کا مطالبہ کرے"۔ اس خیال کی صداقت اُس وقت

اور زیادہ مستحکم ہو جاتی جب یہ لوگ ایک ایسی حکومت کے متعلق سوچتے جو اُن کے گھروں سے سینکڑوں میل دور تھی اور عام طور پر ایسے مسائل سے تعلق رکھتی جن کے متعلق ان لوگوں کو بہت کم معلوم تھا اور دلچسپی بھی کم تھی۔

جداگانہ ریاستوں میں نشوونما پانے والی یہ جماعتیں اپنے تشخص کے بارے میں خاصے رشک سے کام لیتیں اور چوکنا رہتیں۔ انہیں مقامی طور پر قوت کے ارتکاز کے مسئلہ میں عوامی حمایت پر یقین کامل ہوتا کیونکہ مقامی اور ریاستی سطح پر عوام اور سیاست دانوں کے نزدیک کوئی ایسی وجہ نہ تھی، جس کی بنا پر وہ قومی سطح پر اپنی طاقتوں کو (کسی مرکز کی طرف) منتقل کر دینے کو ایک جماعتی اصول کے طور پر تسلیم کر لیتے۔ نیو انگلینڈ کے علاقہ کا شہری اجتماع ان لوگوں کا آدرش اور نصب العین تھا جہاں لوگ مل جل کر اپنی اجتماعی اور شہری زندگی کے بارے میں فیصلے کرتے۔ شہری حکومتیں، شہری اجتماعات کی طرح نہیں چلا کرتیں، لیکن انیسویں صدی کے مصنفین اور مقررین کے ذہن میں مقامی حکومتیں ریاستی حکومتوں کی نسبت عوام سے قریب تھیں۔ اور قومی حکومت کے مقابلہ میں تو قریب تر تھیں۔

کسی سیاسی تنظیم کی قوت کا مرکز اور سرچشمہ کہاں ہے؟— اس کا جواب نامزدگی کے اختیار میں پوشیدہ ہے۔ یہ اختیار ریاستوں کو حاصل ہے یا اس سے بھی نچلی سطح پر استعمال کیا جاتا ہے۔ شہروں اور دیہاتوں کی حد تک یہ اختیار کم و بیش پوری طرح جماعتوں کے مقامی عہدہ داروں یا شہریوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقوام

متحدہ کی سینٹ اور کانگریس کے ارکان کے انتخاب میں مقامی جماعت کے عہدہ داروں کو اس سے کہیں زیادہ قوت حاصل ہے، جو قوت جماعت کے قومی عہدہ داروں کو ریاستی یا مقامی عہدہ داروں کے انتخاب میں حاصل ہے۔

اگرچہ شہری رہنما کبھی کبھی جماعت کے سلسلۂ مدارج کے بلند ترین درجے میں بھی اثر و رسوخ پیدا کر لیتے ہیں، لیکن عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ قومی، ریاستی اور مقامی سطح پر جماعت کے رہنما ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ تمام سطحوں پر تنظیمی رہنما ایوان نمائندگان کے انتخاب سے جس حد تک اپنے آپ کو الگ رکھتے ہیں، وہ حیرت ناک ہے۔ کانگریس کے نمائندوں کی یہ خود مختاری ملک کے نسبتاً کم آباد حصوں میں اور زیادہ نمایاں نظر آتی ہے جہاں جماعت کی قیادت کم سے کم درجہ میں بھی روایتی طور پر ایک غیر مستحسن بات سمجھی جاتی ہے۔ ان حصوں میں مغربی وسطی حصہ، عظیم میدانی علاقہ اور بحر اسکاہل کے ساحلی علاقے شامل ہیں۔

جماعتیں "بے نظم" ہیں Parties are undisciplined

۱۹۶۰ء میں ڈیموکریٹک جماعت نے حکومت کے نظم و نسق پر پورا اختیار حاصل کر لیا تھا۔ سینیٹر جان ایف۔ کینیڈی صدر منتخب کئے گئے اور ڈیموکریٹوں کو کانگریس کے دونوں ایوانوں میں مستحکم اکثریت حاصل ہوئی لیکن صدر کینیڈی کی صدارت کے افتتاح

کے تین ہفتوں کے اندر ایوان نمائندگان نے ایک ایسی تنظیمی تبدیلی کی جس کی خواہش صدر اور ڈیموکریٹک رہنماؤں نے کی تھی کیونکہ تنسیخ کے لئے ۲/۳ ارد ریپبلکن ووٹوں کی لازمی ضرورت تھی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ایک ڈیموکریٹک کمیٹی نے ایوان کے سامنے ایک ایسا قانونی بل پیش کرنے سے انکار کر دیا جسے صدر کی پوری پوری حمایت حاصل تھی۔

یہ واقعات دلچسپ ضرور تھے لیکن امریکی کانگریس کی سیاست میں کسی غیر معمولی حیثیت کے حامل نہ تھے۔ ان واقعات سے محض یہ بات ایک بار اور واضح ہو گئی، صدر یا کانگریس کی اکثریتی جماعت کے رہنما، تمام اہم مسائل پر کانگریس میں اپنی جماعت کے ارکان کی حمایت ہمیشہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہر سال دونوں جماعتوں کے کچھ نہ کچھ ممبر نہایت اہم مسائل پر دونوں ایوانوں میں اپنے قائدین (اور جماعت) سے خلاف رائے دیتے ہیں۔ لیکن اس بنیاد پر (جماعتی) قومی قیادت نے شاید ہی کبھی کسی کے خلاف تادیبی کارروائی کی ہو، کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ کانگریس اور سینیٹ کے ارکان کو اپنے فیصلے کرنے اور آزادی کے ساتھ رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر قومی رہنما، صدر کی شمولیت کے ساتھ کانگریس کے کسی منحرف رکن کی دوبارہ نامزدگی کو روکنے کی کوشش کریں تو مقامی جماعت یقیناً اسے دوبارہ نامزدگی کرے گی، بلکہ آنے والے انتخاب

میں اسے حزب اختلاف کی حمایت بھی حاصل ہوگی۔ فرینکلن روزویلٹ امریکی تاریخ کے ایک نہایت ہی مقبول اور ہردلعزیز صدر تھے لیکن جب انھوں نے سینٹ کے ان ڈیموکریٹک ارکان کی دوبارہ نامزدگی کو روکنے کی کوشش کی جنہوں نے ان کی مجوزہ قانونی اور آئینی تجاویز کی حمایت نہ کی تھی، تو روزویلٹ کی مخالفت کا یہ اثر مرتب ہوا کہ اُن ارکان کی فتح، فتح مبین بن گئی اور انھیں زیادہ عوامی حمایت حاصل ہوئی۔

تنظیم کی اس کمی پر امریکہ کے مصنفین نے تنقید کی ہے اور ان غیر ملکی نقادوں نے بھی جو منتخبہ ارکان کی اس آزادی کو انتشار اور امریکہ کے پورے سیاسی نظام کی کمزوری کی علامت سمجھتے ہیں لیکن کانگریس کے ارکان کی اس آزادی کو روایت، انتخابی انتظامات اور علاقائی جانب داری کے پس منظر میں آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ امریکی جماعتوں کے کئی مرکز ہوتے ہیں اور ریاستی سطح پر ان کے ضوابط مرتب کئے جاتے ہیں [11]۔ چار سالہ صدارتی انتخابی مہم سے قطع نظر یہ جماعتیں حقیقی معنوں میں قومی تنظیم کا درجہ نہیں رکھتیں۔ سیاسی اسباب کی بنا پر ایک جماعت، ملک کے ایک بڑے حصہ پر غالب رہ سکتی ہے۔ خانہ جنگی میں شکست اور جنگ کے بعد تعمیر نو کے عہد سے ری پبلکن

جماعت کی وابستگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سو سال سے جنوب کی گیارہ ریاستیں ڈیموکریٹک جماعت کے ساتھ مستحکم وابستگی اور وفاداری کا ثبوت دے رہی ہیں لیکن یہ وفاداری ڈیموکریٹک جماعت کے نام کے ساتھ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ریاستیں ڈیموکریٹک صدارتی امیدواروں یا کانگریس میں اس جماعت کے رہنماؤں کے مقاصد اور پروگرام سے پورا پورا اتفاق رکھتی ہیں۔ جب صدر یا کانگریس کے جماعتی رہنما ایسی آئینی اور قانونی تجاویز پیش کرتے ہیں جو جنوب کے ڈیموکریٹوں کے نزدیک ان کے مفاد کے خلاف ہوں، تو جنوب کے ارکان کانگریس جماعتی قیادت کے خلاف ووٹ دیتے ہیں۔ جماعت کے رہنما جنوب کے نجی اور کانگریس کے ارکان کے خلاف اپنی نہایت درجہ خواہش کے باوجود کوئی تادیبی کارروائی نہیں کر سکتے کیونکہ قومی قیادت کو جنوب کی ریاستی ڈیموکریٹک تنظیموں میں کوئی قوت حاصل نہیں ہے۔ اور خاص طور پر اس وقت جب مسائل زیر غور جنوب کے مفادات کے خلاف معلوم ہوتے ہوں۔

یہ بات حد درجہ مشکوک اور غیر یقینی ہے کہ قومی رہنماؤں کو نامزدگی کے طریق کار میں کوئی حقیقی قوت حاصل ہوتی تو وہ جنوب کے ڈیموکریٹوں کو نکالنے کی کوشش کرتے۔ ۱۹۶۰ء میں جنوب کے ووٹوں کے بغیر صدر کینیڈی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور اسی طرح گیارہ جنوبی ریاستوں کے تقریباً سو ڈیموکریٹک ارکان کانگریس کے بغیر ڈیموکریٹوں

گویا ان نمائندگان میں اکثریت حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ ان حالات میں
ڈیموکریٹک سیاستدانوں کے نزدیک بعض علاقائی مسائل پر گاہے گاہے
کانگریس میں جنوب کی مخالفت، وہ کم سے کم قیمت ہے جو ڈیموکریٹک
جماعت اپنے اقتدار کے لئے ادا کرتی ہے۔ اگر اس قیمت پر ڈیموکریٹک
حکومت قائم رہے تو یہ سودا گراں نہیں ہے۔ اگر جماعت بعض اہم ترا
مقاصد کے لئے اپنے تمام ارکان کو متحد رکھنا چاہتی ہے تو بعض مسائل
پر اُسے اپنے ارکان کو اختلاف کی اجازت بھی دینی ہو گی۔

یک جماعتی ریاستوں کے نمائندوں پر "تنظیم" نافذ کرنے کے ایسے
نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جو ان ریاستوں کے باشندوں، اُن کے
منتخبہ نمائندوں یا جماعت کے رہنماؤں کو پسند نہ آئیں۔ شمال کی
بعض ریاستیں اُسی درجہ شدید ری پبلکن ہیں، جس قدر جنوب کی
ریاستیں ڈیموکریٹک ہیں۔ تنظیم کے (جبری) نفاذ سے یا تو ووٹروں
کی نئی جماعتی وابستگی وجود میں آئے گی اور نئی جماعتیں اُبھریں گی
یا پھر ووٹر ان امیدواروں کو منتخب کرنے کے مواقع سے محروم
ہو جائیں گے جو علاقائی ترجیحی پالیسیوں کے ساتھ اپنے آپ کو
وابستہ رکھتے ہیں۔ کسی علاقہ کی مضبوط جماعت کے عہدہ دار اور
امیدوار اس علاقہ کی سیاسی صورت حال میں کسی قسم کی تبدیلی
نہیں چاہتے۔ اس بات کا اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے کہ سیاسی قوتوں کی
نئی وفاداریوں اور وابستگیوں کے نتیجہ کے طور پر ایک نہایت

مضبوط حزب اختلاف سامنے نہ آجائے۔ کانگریس کی جماعتی قیادت اس حمایت کو کھونا نہیں چاہتی جو اسے کمیٹی اور جماعتی مناصب کے لئے حاصل ہوتی ہے۔

مقننہ اور انتظامیہ کے درمیان تقسیم قوت، ایک بے نظم جماعتی نظام کے جاری رکھنے کے حق میں دوسری دلیل ہے۔ ریاستوں اور قومی حکومت کے سربراہ، مقننہ سے علیحدہ چنے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود صدر اور صوبائی گورنر، قانون سازی کے باب میں اہم شخصیتیں ہیں۔ انتظامیہ کے سب سے بڑے سربراہ (صدر) اور قانون ساز اداروں کے راست اور بلا واسطہ انتخابات کا مطلب یہ ہے کہ ووٹروں نے انہیں اختیارات کا ایک فرمان اور مختار نامہ دے دیا ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ مختار نامہ ہمیشہ ایک نہیں ہوتا۔

صدر ایک ایسے انتخابی حلقہ سے چنا جاتا ہے جو بڑی حد تک ملک کے بڑے صنعتی علاقوں کے شہریوں کے ووٹوں سے عبارت ہوتا ہے اور کانگریس کی تشکیل وہ لوگ کرتے ہیں جو ملک کے ہر حصے اور علاقے سے چنے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ شہری رجحانات رکھتے ہیں، کچھ دیہی نقطۂ نظر پھر ان کے علاوہ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو علاقوں (اور ریاستوں) سے دلچسپی رکھتے ہیں اور شہری و دیہی رہائش کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ صدر اور کانگریس کے لئے لازم ہے کہ وہ مل کر ملک کے لیے حکمت عملی وضع کریں۔ یہ فریضہ اس وقت بھی انجام

دینا ہوگا جب صدر ایک جماعت کا ہو اور کانگریس کے ایک یا دونوں
ایوانوں میں حزب اختلاف کی اکثریت ہو۔ ان حالات میں منظم
اور نظریاتی جماعتیں ملک کو بحران اور انتظامی خلفشار میں مبتلا کر سکتی
ہیں۔ غیر نظریاتی اور "غیر منظم" جماعتیں اس صورت حال سے کامیابی
کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتی ہیں اور ہو چکی ہیں۔ صدر آئزن ہاور
(ری پبلکن) کے آٹھ سالہ عہد انتظام کے چھ سال ایسے تھے جن میں
مخالف ڈیموکریٹک جماعت کو کانگریس کے دونوں ایوانوں میں اکثریت
حاصل تھی۔ اس کے باوجود اس پوری مدت میں کانگریس اور صدر
آئزن ہاور کے درمیان ایسی ہم آہنگی اور اشتراک رہا کہ حکومت کے
کام کسی خلفشار کے بغیر نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہوتے رہے۔ یہ بات
کہی جا سکتی ہے کہ ایک ڈیموکریٹک کانگریس اور ایک ری پبلکن صدر کے
درمیان کم و بیش اسی قدر اشتراک عمل تھا، جس کی مثال چند سال پہلے
اس وقت ہمارے سامنے آئی تھی جب حکومت کی دونوں شاخوں (انتظامیہ
اور قانون ساز) پر ڈیموکریٹک جماعت کو اقتدار حاصل تھا۔ بحث یوں بھی کی
جا سکتی ہے کہ ایک ری پبلکن صدر ایک ڈیموکریٹک کانگریس کے ساتھ اس
ڈیموکریٹک صدر کی نسبت بہتر طور پر کام چلا سکتا ہے جس کے ساتھ
ری پبلکن کانگریس ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ایک ری پبلکن صدر زیادہ آزاد
خیال ہوتا ہے اور شاید وہ ڈیموکریٹک کانگریس سے، ایک ری پبلکن
کانگریس کے مقابلہ میں بھی، زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہ بات درست
ہو سکتی ہے، مگر یہ بات بھی اسی قدر حقیقی اور سچی ہے کہ ۱۹۴۷ء سے

۱۹۴۹ء تک ڈیموکریٹک صدر ٹرومین اور ری پبلکن کانگریس نے اس درجہ ہم آہنگی اور تعاون کا ثبوت دیا کہ بیسویں صدی میں امریکہ کی خارجہ حکمت عملی کے کئی نہایت اہم پروگرام وضع کیے گئے۔

اس اشتراک کا تعلق صرف جماعتی تنظیم کی کمی یا فقدان سے نہیں ہے بلکہ اس حقیقت سے بھی ہے کہ امریکی جماعتی نظام میں جماعتوں کی کسی نظریاتی وابستگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ غالباً "دو جماعتی نظام" میں یہ خصوصیت ہوتی ہے۔

امریکی جماعتیں غیر نظریاتی ہیں

"دو جماعتی نظام" میں دونوں جماعتوں کو عملی طور پر غیر نظریاتی ہونا چاہیئے، خواہ وہ کاغذی طور پر غیر نظریاتی نہ ہوں۔ اگر شدید نظریاتی اختلافات اور تفرقے موجود ہوں تو انتخابات میں شکست کے بعد ایک جماعت کے لئے یہ بات ممکن نہ ہوگی کہ وہ حکومت کا اختیار و اقتدار دوسری جماعت کے سپرد کر دے۔ علاوہ ازیں ملک کی ذہنی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ ملک کبھی رجعت پسندی کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی آزاد خیالی اور زیادہ فعالیت کی طرف۔ رائے عامہ کے اس رجحان کو دونوں جماعتوں میں سے کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتی، ورنہ وہ ووٹروں کی ایک بڑی اکثریت سے کٹ جائے گی۔

امریکی جماعتیں نظری اور عملی طور پر غیر نظریاتی ہیں۔ دونوں جماعتوں کے رہنماؤں اور ارکان میں مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے

والے شامل ہیں۔ کلنٹن "سینٹر کے الفاظ میں" امریکی جماعتیں مفادات کے امتزاج اور سمجھوتوں کی ایسی تخلیق ہیں جن میں اصول اکثر خاموش اور گونگا بن جاتا ہے۔ یہ جماعتیں نہایت وسیع، دوستانہ، مہربان بھڑکیلی اور رنگ برنگی چھتریوں کی طرح ہیں جن کے نیچے کھڑے ہو نے کی دعوت تمام امریکیوں کو دی جاتی ہے تاکہ انھیں اگلے انتخاب میں گنا جا سکے۔ یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ یہ امریکی کون ہیں، کس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں" سلے

امریکی عوام کی ایک عظیم اکثریت کی طرح دونوں جماعتوں کے رکن اور رہنما جمہوری سیاسی اداروں کی بقا اور تسلسل میں ایمان رکھتے ہیں۔ دونوں جماعتیں اس بات کو ایک حقیقت کی طرح تسلیم کرتی ہیں کہ حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ معاشرہ کی معاشرتی اور معاشی زندگی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے، لیکن دونوں جماعتیں اس نظریہ کو رد کر دیتی ہیں کہ حکومت ملک کی معیشت کی ملکیت یا کامل انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ دونوں جماعتیں تاجروں، مزدوروں، پیشہ ور گروہوں اور کسانوں سے اپیل کرتی ہیں۔ چونکہ دونوں جماعتیں معاشرہ کے ہر گروہ کے افراد سے تعلق رکھتی ہیں اسی لیے وہ لازمی طور پہ اعتدال پسند ہیں انھیں نہ تو بائیں بازو کی انتہا پسند جماعت کہا جا سکتا ہے اور نہ دائیں بازو کی انتہا پسند جماعت۔

سلے سیاست اور جماعتیں۔ امریکہ میں (کارنل یونیورسٹی پریس، مطبوعہ ۱۹۶۰ء)

اُس مختصر مدت کے سوا جب خانہ جنگی کے لئے حالات ہموار ہوئے اور ملک خانہ جنگی میں مبتلا رہا، امریکہ کی دونوں جماعتیں ایک دوسرے سے بہت دور کبھی نہیں رہیں۔ اس وقت حبشیوں کی غلامی اور آزادی ریاستی اتحاد اور افتراق کے مسائل نے ملک اور جماعتوں کو اس حد تک ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا کہ کسی سمجھوتے کی گنجائش نہ تھی۔ اس کے بعد سے اب تک دونوں جماعتوں نے اختلافی مسائل کو اس حد تک آگے نہیں بڑھنے دیا۔ دونوں جماعتوں کے ارکان اور رہنماؤں میں مختلف خیالات کے لوگ رہے ہیں۔ محض اپنی رکنیت کو برقرار رکھنے کے لئے جماعتیں انتہاپسندی سے گریز کرتی رہی ہیں۔ خانہ جنگی کے اختتام سے ۱۹۳۲ء میں فرینکلن روزولٹ کے انتخاب تک۔ اس درمیانی مدت میں جنوب کے ڈیموکریٹ اس جماعت کی قوت کی بنیاد رہے ہیں۔ جنوب کی قیادت متوسط طبقہ کے افراد پر مشتمل تھی۔ تاجر، وکیل اور ایسے ہی دوسرے پیشہ ور افراد۔ شمال میں ڈیموکریٹک جماعت کی توسیع ۱۹۳۲ء کے انتخاب کے بعد تیزی کے ساتھ ہوئی۔ شمال میں ڈیموکریٹک جماعت کو سب سے زیادہ مزدوروں اور اقلیتی گروہوں کی حمایت حاصل ہوئی۔ بعض مسائل پر جنوبی ڈیموکریٹ اپنے شمالی رفیقوں کے ساتھ متحد رہے ہیں اور بعض مسائل پر انھوں نے اپنے آپ کو ری پبلکنوں سے قریب تر پایا ہے۔ شہری حقوق کے مسائل پر ری پبلکنوں اور

شمالی ڈیموکریٹوں کے درمیان رفقائے کار کا سا اتحاد و اتفاق رہا ہے اور جنوبی ڈیموکریٹ حزب اختلاف کی طرح الگ رہے ہیں۔

ڈیموکریٹوں کی طرح گھریلو اور بین الاقوامی مسائل پر ری پبلکن بھی رجعت پسند یا آزاد خیال ہو سکتے ہیں اور اس کا تعلق بڑی حد تک ان کے انتخابی حلقہ سے ہوتا ہے۔ سینیٹر جیوٹس، کیٹنگ اور کیس جیسے مشرق کی صنعتی ریاستوں کے ری پبلکن نمائندے بڑی حد تک دوسری مشرقی صنعتی ریاستوں کے ڈیموکریٹک نمائندوں کی طرح ووٹ ڈالتے ہیں۔ وسطی مغربی ریاستوں اور بڑے میدانی علاقوں کے ری پبلکن نمائندے عام طور پر اپنے نقطۂ نظر میں زیادہ رجعت پسند ہوتے ہیں، کیونکہ یہ علاقے بڑی حد تک دیہی ہیں اور یہاں چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں، بڑے بڑے شہر نہیں۔

ایک مساوی طور پر بٹی ہوئی کانگریس میں عام طور پر ڈیموکریٹوں اور ری پبلکنوں کا ایک اتحاد، ایسے ہی دوسرے کمزور تر اتحاد کے مقابلہ میں قوانین منظور کرا لیتا ہے۔ عہدہ داروں کے ووٹوں کے تعین میں جماعت کے نظریہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، بلکہ اپنی ریاستوں اور اضلاع میں رائے دہندگان کا رویہ عہدہ داروں اور کانگریس کے اراکین کے ووٹوں کا تعین کرتا ہے۔

دونوں جماعتوں میں وہ انتہا پسند بھی ہوتے ہیں جو دونوں جماعتوں کے اختلافات کی خلیج کو وسیع کر دینا چاہتے ہیں۔ عمومی طور

پرجماعتوں کے قائدین میں یہ انتہا پسندی نہیں ملتی۔ ان کی زیادہ تر
توجہ انتخابی فتح پر رہتی ہے اور یہ ان اسباب پر نہیں لڑتے جو انہیں
عوام سے دور کر سکتے ہیں۔ اسی لیے جماعتی رہنما انتہا پسندوں کے مشورہ
کو زیادہ قابلِ التفات نہیں گردانتے۔ زیادہ تر سیاست داں عام
حالات میں ان مسائل کو ابھارنے اور اپنانے سے انکار کر دیتے ہیں
جو عوام کو دو متصادم گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

نتائج اور خلاصۂ بحث

امریکی جماعتی نظام کے ملکی و غیر ملکی نقادوں کے علی الرغم امریکی جماعتیں
خوش اسلوبی کے ساتھ ملک کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ ان جماعتوں کے
قائد اور ان کی انتخابی حمایت کرنے والے معاشرہ کے ہر حصہ اور گروہ
سے تعلق رکھتے ہیں۔ خانہ جنگی کے عہد کے علاوہ ان جماعتوں نے ایسے
مسائل سے ہمیشہ پہلوتہی کی ہے جن پر سمجھوتہ نہ کیا جا سکے۔ جمہوریت کی
بقا کے بارے میں جماعتی قائد کے موقف اور اس حقیقت کے ادراک
نے امریکی جماعتوں کو اعتدال پسند بنا دیا ہے کہ انتہا پسندی سے انتخابات
میں فتح کے امکانات شکست میں بدل سکتے ہیں۔ اس اعتدال پسندی کو
رائے دہندگان نے قبول کر لیا ہے کیونکہ انھوں نے "تیسری" جماعتوں
کے ان امیدواروں کی حمایت سے متواتر انکار کیا ہے جو ہر نئے انتخاب
کے موقع پر سامنے آتے ہیں۔ جماعتوں کی لامرکزیت اور تقسیم اختیارات
نے تنظیمی سادگی کی جگہ نہیں لی ہے۔ ان دونوں خصوصیات نے

امیدواروں کو اپنے مخصوص اضلاع کی نمائندگی کی جو آزادی دے رکھی ہے اس سے وہ ممالک نا آشنا ہیں جہاں منظم سیاسی جماعتیں ہیں۔ اپنے انتخابی اضلاع کے ووٹروں کی ترجمانی کی یہ آزادی امریکہ جیسے وسیع اور متنوع ملک میں امیدواروں اور ارکان مقننہ کے لئے لازمی ہے۔ کانگریس میں کوئی ایک جماعت فیصلے نہیں کرتی بلکہ ڈیمو کریٹ اور ری پبلکن مل کر فیصلے کرتے ہیں۔ سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ فیصلے کئے تو جاتے ہیں۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ عوام کی کسی شدید خواہش اور ضرورت کا اظہار اور ترجمانی اس بنا پر نہ ہوسکی ہو کہ جماعتی رہنما اپنی جماعت کے ارکان کو کانگریس میں کسی مسئلہ کی موافقت یا مخالفت میں ووٹ دینے کا حکم نہیں دے سکتے۔

کبھی کبھی صدر اور کانگریس میں اس کی جماعت کے کچھ ارکان متضاد مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ جماعتی تنظیم کی کمی اور یہ حقیقت ہے کہ دونوں جماعتوں میں رجعت پسند اور آزاد خیال رکن ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان انتخابی حلقوں کے فرق کو ذہن میں رکھیں جو صدر اور کانگریس کے لئے اس کی جماعت کے ارکان کو منتخب کرتے ہیں تو یہ بات زیادہ تعجب خیز نہیں رہ جاتی۔

صدر اور اس کی جماعت کے ارکان کے درمیان پالیسی کے اختلافات خارجی مسائل سے زیادہ داخلی مسائل کے بارے میں اہم ہوتے ہیں۔ امور خارجہ کے سلسلہ میں صدر کو بعض ایسے آئینی اختیارات

حاصل ہیں جن کی وجہ سے وہ قوم کا ترجمان بن گیا ہے۔ خارجہ پالیسی کے بعض معاملات میں وہ کانگریس کی حمایت کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ بعض معاملات میں وہ اپنے عمل کے ذریعہ کانگریس کو اپنی حمایت پر مجبور کر سکتا ہے۔ نئی پالیسیوں کو وضع کرتے ہوئے صدر کو کانگریس میں اکثریت کی حمایت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے بغیر وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر صدر کو یہ حمایت آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ صدر کی خارجہ پالیسی اور فیصلوں پر ارکان کانگریس کی تنقید کا ہدف پالیسی کی جگہ مختلف طریق ہائے کار اور قوت کی کمی جیسی چیزیں ہوتی ہیں۔ سینیٹ اور ایوان نمائندگان کے چند رکن صدر کی پالیسیوں کی مذمت کر سکتے ہیں، لیکن ایسے لوگ چند بلکہ مٹھی بھر رفقاء کے سوا کسی کی ترجمانی نہیں کرتے۔ تصرفات اور قبضہ کے مسئلہ کے علاوہ وہ قوت صدر کے ذات میں مرکوز رہتی ہے، جو کانگریس میں دونوں جماعتوں کے ارکان سے اپنی خارجہ حکمت عملی کی تائید کی توقع کر سکتا ہے۔

۶

نامزدگیاں اور انتخابات

صدر کے سوا تمام عوامی عہدیداروں کے انتخاب میں امریکی ووٹر دہرا کردار ادا کرتا ہے۔ اول تو وہ پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے بنیادی کانفرنسوں میں شریک ہوتا ہے اور اپنی پسند کے امیدوار منتخب کرنے میں پارٹی کی مدد کرتا ہے۔ دوسرے ایک شہری کی حیثیت سے وہ عام انتخابات میں حصہ لیتا ہے اور یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کس پارٹی اور کن لوگوں کو سرکاری عہدوں کے لیے چننا چاہیئے۔ دوسرے کم درجہ کے عہدیداروں کا انتخاب' صدارتی انتخاب سے مختلف طریقہ پر ہوتا ہے۔ صدارتی انتخاب کے طریقۂ کار پر ہم آئندہ باب میں روشنی ڈالیں گے۔

عوامی عہدیداروں کی نامزدگی اور انتخاب کے قاعدے مرتب کرنے میں قومی حکومت اور ریاستی حکومتوں دونوں کو دخل ہوتا ہے لیکن بڑی حد تک یہ سارا کام ریاستوں کے دائرۂ عمل میں رہتا ہے۔ قومی حکومت تو صرف ایسے قوانین منظور کرتی ہے جس کی وجہ سے عہدیداروں کے انتخاب میں بدعنوانی نہ ہو اور انتخابی مہم کے اخراجات مقررہ حد سے آگے نہ بڑھنے پائیں۔ ابھی پچھلے چند برسوں میں صدر اور کانگریس نے رائے شماری کے معاملہ میں نیگرو باشندوں کے

ساتھ امتیاز کا رویہ ختم کرنے کے لئے مداخلت کی ہے ورنہ بقیہ تمام قاعدے اور ضابطے ریاستی حکومتیں ہی بناتی ہیں۔

چونکہ انتخابی طریق کار کے ضابطے ریاستیں بناتی ہیں اور ان کی تعداد پچاس ہے اس لئے نامزدگی اور انتخاب سے متعلق پچاس قسم کے ضابطے پائے جاتے ہیں۔ عہدیداروں کے انتخاب کے رسمی اور غیر رسمی انتظامات کا دارومدار بڑی حد تک ان حالات پر ہوتا ہے جو مختلف ریاستوں میں بنیادی عام انتخابات کے واسطے بنائے جاتے ہیں اور یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ تمام ریاستوں کے حالات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ آج کل ہر ریاست میں بنیادی عام انتخاب کا کوئی نہ کوئی طریقہ موجود ہے۔ البتہ ملک کے مختلف علاقوں میں ان کی نوعیت مختلف ہے۔ جہاں تک عام اور قطعی انتخابات کا تعلق ہے اس کے قاعدے ملک بھر میں بڑی حد تک یکساں ہیں لیکن عام انتخابات کی اہمیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہر ریاست میں دونوں بڑی پارٹیوں کے امیدواروں میں کس پیمانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔

ووٹروں کا اندراج اور پارٹی کی رکنیت

اگر کوئی امریکی باشندہ ووٹر بننا چاہتا ہے اور نامزدگی اور انتخاب میں شریک ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جس ضلع میں رہتا ہے وہاں کے سرکاری دفتر میں اس کا نام ووٹر کی حیثیت سے درج ہو۔ بہت سے ملکوں میں ووٹروں کے اندراج کا طریقہ رائج ہے لیکن امریکہ میں انوکھا

قاعدہ ہے کہ وہاں نام درج کرانے کی ذمہ داری خود باشندوں پر ہوتی ہے۔

سب سے پہلے میسا چوسیٹس میں ووٹروں کے اندراج کا قاعدہ شروع ہوا تھا۔ یہ انیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے۔ پچاس برس کے اندر اندر کئی اور ریاستوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ البتہ رجسٹریشن کے قاعدے اور ضابطے بہت بعد میں مرتب ہوئے تھے۔ اصل میں شہری آبادی بڑھنے کی وجہ سے ووٹروں کے ناموں کا اندراج اور ان کی شناخت ضروری ہو گئی تھی۔ گاؤں اور قصبوں میں تو آج بھی ناموں کا اندراج غیر ضروری ہے کیونکہ وہاں کے باشندے اپنے گھروں میں مستقل سکونت رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے الکشن کے حکام اپنے علاقے کے تمام لوگوں کو جانتے پہچانتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ریاستی حکومتیں دیہی علاقوں کو ناموں سے مستثنیٰ قرار دے دیتی ہیں۔

بہرحال شہری علاقوں میں ووٹروں کا اندراج ضروری ہے تاکہ بدعنوانیوں کا سدباب کیا جائے۔ انیسویں صدی میں کئی بڑے شہروں میں بدعنوانی ہوتی تھی لیکن اب نہیں ہوتی اس کی وجوہات تو کئی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اب تمام ووٹروں کے لئے اپنے ناموں کا باضابطہ اندراج کرانا ضروری ہے۔

جن ریاستوں میں امیدواروں کی نامزدگی خفیہ طریقے پر ہوتی ہے وہاں ناموں کے اندراج کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ اگر ووٹروں نے کسی خاص پارٹی سے وابستگی کا اعلان کر دیا ہے تو وہ بنیادی کانفرنس میں

شریک ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ممبر رجسٹریشن کے حکام کو نہ صرف اپنا نام اور پتہ بتاتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کا نام ری پبلکن کی فہرست میں درج کیا جائے یا ڈیموکریٹ کے ساتھ ـــــ اگر وہ چاہے تو کسی پارٹی سے وابستگی کے بغیر بھی اپنا نام درج کرا سکتا ہے لیکن اس صورت میں وہ پارٹی کے امیدواروں کی نامزدگی کرنے والی بنیادی کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکتا بہر حال وہ کسی پارٹی سے وابستہ ہو یا نہ ہو، دونوں پارٹیوں کے نامزد امیدواروں کے عام انتخابات میں اسے اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دینے کی آزادی حاصل رہتی ہے۔

ناموں کے اندراج کے طریقے

عام طور پر اندراج کے دو طریقے ہیں۔ بعض ریاستوں میں تو ہر سال اندراج کرانا ضروری ہے لیکن بیشتر ریاستوں میں مستقل اندراج کا طریقہ رائج ہے۔ سالانہ رجسٹریشن کا طریقہ اس خیال سے شروع کیا گیا تھا کہ ووٹر ہر سال اندراجات کرنے کے لئے حاضری دیں گے جس کی وجہ سے دھوکے فریب کے امکانات کم ہو جائیں گے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے اور مستقل اندراج کے باوجود انتخابات میں کچھ نہ کچھ بدعنوانی اور بے قاعدگی ضرور رہتی ہے۔ ہر سال اندراج کرانا بھی ایک دردِ سر ہے اور ہر سال ووٹروں کے ذہن پر ایک بار رہتا ہے۔

مستقل اندراج کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہر مستحق شہری اپنا نام، پتہ

اور حلقہ سرکاری دفتر میں لکھا دیتا ہے اور جب تک وہ کسی اور جگہ نہ چلا جائے یا کسی اور وجہ سے اس کا نام خارج نہ ہو جائے اس وقت تک اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

لیکن بعض ریاستوں میں اندراج کی فہرست سے ناموں کو خارج کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ مسلسل دو تین انتخابات میں ووٹ نہیں ڈالتے، ان کے نام فہرست سے نکال دئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ ریاستوں میں وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کا انتظام ہے۔ اور جب کوئی مر جاتا ہے یا کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے تو اس کا نام ووٹروں کی فہرست سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ ماہرین کی رائے یہ ہے کہ اگر مستقل اندراج کے ساتھ ساتھ فہرست میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا بھی انتظام ہو تو یہ طریقہ سالانہ رجسٹریشن سے بہتر ہوتا ہے۔

نامزدگیاں

صدر کے سوا باقی تمام عہدیداروں کی نامزدگی بنیادی کانفرنس میں کی جاتی ہے حالانکہ امریکہ کی آزادی کے تقریباً سو برس بعد تک یہ طریقہ رائج نہیں تھا۔ اس وقت دوسرے طریقے رائج تھے لیکن تجربہ کے بعد ناقص قرار دے دیئے گئے۔ سب سے پہلے نامزدگی کا طریقہ یہ تھا کہ علاقے کے لوگ جمع ہو کر امیدوار کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ طریقہ تو اتنا پرانا ہے کہ آزادی سے پہلے بھی اس کا رواج تھا۔ علاقے کے چند مخلص اور سمجھدا

لوگ ایک جگہ بیٹھ کر طے کر لیتے تھے کہ مجلس قانون ساز کے لیے کس کو امیدوار بنایا جائے۔ انقلاب آزادی کے بعد بھی نئی ریاستوں کے لوگوں نے یہی طریقہ باقی رکھا۔

بعض ریاستوں میں یہ کام عام لوگوں کی جگہ مجلس قانون ساز کے ممبروں کو سونپ دیا گیا۔

پہلے پہل جیفرسن کی پارٹی ڈیموکریٹک ری پبلکن کی حمایت کرنے والے اسمبلی کے ارکان جمع ہوئے اور انھوں نے کانگریس کے ممبروں اور دوسرے عہدیداروں کے لیے امیدواروں کی ایک فہرست تیار کر لی تھی بعد میں فیڈرسٹ نے بھی نامزدگی کا یہی طریقہ اپنا لیا۔ اس طریقے میں بعض خامیاں تھیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ پارٹی کے جو ممبر مخالف پارٹی کے اسمبلی کے ممبروں کو ووٹ دیتے تھے انہیں اس میں نمایندگی نہیں ملتی تھی۔ اس لیے وہ اسمبلی کے ممبروں کے ذریعہ سرکاری عہدیداروں کے انتخاب کی مخالفت کرتے تھے۔ اس شکایت کو دور کرنے کے لیے یہ طریقہ نکالا گیا کہ جن لوگوں کو نمایندگی نہیں ملتی تھی انھیں بھی اسمبلی کے ممبروں کے ساتھ مل کر امیدوار نامزد کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

کنونشن کا رواج

اس منظر کہ اجتماع میں بھی عوامی نمایندگی کا مطالبہ نہیں ہوتا تھا ۱۸۲۴ء میں اس مقصد کے لیے کانگریس کے ممبروں کا اجتماع ہوا اور اس کے

ساتھ ہی پرانا طریقہ ختم ہوگیا۔ اس سال یہ ہوا کہ ووٹروں اور صدارتی انتخاب کنندوں نے امیدوار کرا فورڈ کی نامزدگی کی ذرا بھی پروانہ کی اسمبلی کے ارکان کا سب سے بڑا اجتماع ختم ہو چکا تھا اس طرح باقی اجتماعات بھی غائب ہو گئے۔ اس کی جگہ نمائندہ کنونشن بھی شروع ہوا اور ۱۸۴۳ء تک مقامی، ریاستی اور مرکزی حکومت کے تمام عہدیداروں کی نامزدگی کے لئے یہی عوامی طریقہ رائج ہو گیا۔ اس میں تمام اختیار شہریوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ شروع ہی سے پارٹی کے لیڈر ہی کرتا دھرتا بنے رہتے ہیں اور وہی سیاہ سفید کے مالک ہوتے ہیں۔

مقامی اور ریاستی کنونشن میں کافی دھاندلی سے کام لیا گیا شہروں کے سیاسی اداروں نے ذاتی مفاد کے لئے اسے غلط طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پارٹی کے عام آدمی کو کنونشن کے پروگرام اور آدمیوں کے انتخابات میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا سیاسی لیڈر ہنگامی طور پر اجلاس بلا لیا کرتے تھے تاکہ ان کے صرف اپنے آدمی ہی موقع پر پہنچ سکیں۔

یا پھر مقررہ تاریخ کے کافی دن بعد جلسے کرتے تھے اور دوسرے نمائندوں کے پہنچنے سے پہلے ہی جلسہ برخاست کر دیتے تھے۔ بڑے شہروں میں یہ طریقہ بہت عام تھا۔ مشرقی ریاستوں کے مقامی اور ریاستی کنونشنوں میں رشوت خوری اور رشوت ستانی کے الزامات لوگوں کا معمول بن چکے تھے۔

دریائے مسی سی پی سے کوہستان راکی تک اور جنوب میں کولوراڈو اور کنساس تک کے علاقوں کے کسان اور چھوٹے شہروں کے عام باشندے

کنونشن پر اعتماد نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ ان پر ایسے سیاسی لیڈروں کا غلبہ ہے جو مشرق کے دولت مند اور تاجر طبقے کے حاشیہ بردار ہیں۔ یہ مخالفین پاپولسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور جب ۱۸۹۶ء میں پارٹی ٹوٹ گئی تو عوام دوبارہ ری پبلکن پارٹی سے وابستہ ہوگئے۔ بہرحال وہ سیاسی دھاندلی کے ان حالات سے پریشان اور متفکر تھے کیونکہ ان کی وجہ سے وہ قومی آمدنی میں اپنا جائز حصہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں کوئی توقع اگر ہو سکتی تھی تو وہ صرف اس طرح کہ ری پبلکن پارٹی پر غلبہ حاصل کرلیں۔ کیونکہ علاقے کی سیاست ان ہی کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ کنونشن پر پہلی کاری ضرب وسکونسن میں پڑی جہاں کے گورنر رابرٹ ایم۔ لا۔ فولیٹ نے عوام کی قیادت کا پرچم بلند کیا اور ۱۹۰۳ء میں پوری ریاست میں براہ راست پرائمری سسٹم شروع کیا۔

بنیادی طریقہ انتخاب کا پس منظر

وسکونسن میں تو بہت بعد میں بنیادی انتخاب کا قانون منظور ہوا اس سے بھی بہت پہلے بعض علاقوں میں مقامی طور پر بنیادی طریق انتخاب رائج تھا۔ شروع میں یہ طریقہ "کرافورڈ کاؤنٹی سسٹم" کے نام سے مشہور تھا پنسلونیا کاؤنٹی پر یہ نام رکھا گیا تھا۔ کیونکہ سب سے پہلے وہیں سے یہ طریقہ شروع ہوا بعد میں انیسویں صدی میں ڈیموکریٹک پارٹی نے ریاست کے باشندوں کو انتخابی پروگرام میں باضابطہ

شریک کرنے کے لئے یہی طریقہ اپنا لیا۔ اس طرح امیدواروں کے انتخاب میں پارٹی کے تمام ممبروں کی آواز سنی جاتی تھی اور یہ بات جنوبی ریاستوں کے لئے خاص طور پر اہم تھی کیونکہ اس علاقے میں نوے فیصدی سے بھی زائد ووٹر ڈیموکریٹک پارٹی کے ہمنوا تھے۔

جب وسکونسن میں بنیادی انتخاب کا طریقہ رائج ہوا تو وسطی مغرب اور بڑے میدانی علاقوں کی تمام ریاستوں نے فوراً اسے اپنایا۔ مشرق کی پرانی ریاستوں میں پارٹی کی تنظیمیں مضبوط تھیں اور وہاں دھاندلی عام تھی۔ چنانچہ انھوں نے نیا طریقہ اختیار کرنے میں بہت لیت و لعل کیا۔ بہرحال سنہ ۱۹۲۰ء تک تقریباً تمام ریاستوں میں امیدواروں کی نامزدگی کے لئے یہ طریقہ رائج ہو گیا اور اب ہر ریاست میں یہی طریقہ رائج ہے۔ سب سے آخر میں کنکٹیکٹ اور رہوڈ آئیلینڈ نے اس طریقے کو اپنایا اور وہاں یہ کسی قدر مختلف ڈھنگ کا ہے۔ یعنی وہاں دوسری ریاستوں کے برعکس اب بھی پارٹی لیڈروں کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔

بنیادی طریقۂ انتخاب کی نوعیت

خفیہ طریق انتخاب۔ اس میں ہر پارٹی کے تمام ممبر امیدواروں کی نامزدگی میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ناموں کے اندراج کے وقت یا بعد میں ہر ووٹر یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ کس پارٹی کا حامی ہے۔ بعض اوقات اسے حلفیہ بیان دے کر یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ اس نے متعلقہ پارٹی کے امیدواروں اور پالیسیوں کی ہمیشہ تائید کی ہے۔ بنیادی

انتخاب عوامی کارکن کراتے اس میں ووٹوں کی پرچیاں چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔
اور انتخاب کا سارا خرچ عوام برداشت کرتے ہیں۔ بیشتر ریاستوں میں خفیہ
ووٹ ڈالے جاتے ہیں لیکن بعض ریاستوں میں مرضی کے مطابق پارٹی بدلنے
کی پوری آزادی ہے۔ کسی کسی ریاست میں یہ قاعدہ بھی ہے کہ پارٹی بدلنے
والے کو ایک یا دو سال تک اس پارٹی کے انتخاب میں حصہ لینے سے محروم کر دیا
جاتا ہے۔
اس کا مقصد یہ ہے کہ بار بار پارٹیاں اور وفاداریاں بدلنے کی روش کا
انسداد کیا جائے۔
کھلے عام طریق انتخاب ـــ وسکونسن اور چند دوسری ریاستوں میں
پارٹی کے امیدواروں کا انتخاب کھلے عام ہوتا ہے۔ ان ریاستوں میں
ووٹر اپنے نام تو درج کراتے ہیں لیکن کسی پارٹی سے اپنی وابستگی کا اظہار
نہیں کرتے۔ انتخابات کے وقت ووٹر کو ایک پرچی ملتی ہے جس میں
انتخاب میں حصہ لینے والی ہر پارٹی کے الگ الگ خانے بنے ہوتے ہیں۔
وہ صرف ایک خانے میں اپنی پسند کے امیدوار کا نام لکھ سکتا ہے۔ اگر ایک سے
زائد پارٹی کے امیدواروں کا نام لکھا گیا تو ساری پرچی ضائع ہو جاتی ہے
اس کے پاس تمام پارٹیوں کے امیدواروں کی فہرست ہوتی ہے اس لئے
کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خود اس کا تعلق کس پارٹی سے ہے۔
اس انتظام کے تحت ری پبلکن ووٹر نہایت آسانی سے ڈیموکریٹک
امیدوار کو ـــ اور ڈیموکریٹک ووٹر ری پبلکن کو ووٹ دے سکتا ہے

اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے۔ دونوں بڑی پارٹیوں کے سوا دوسری جماعتوں کو یقین رہتا ہے کہ وہ عام انتخابات میں ہار جائیں گی۔ اس لئے وہ ان ہی دونوں میں ایسی پارٹی کو ووٹ دے دیتے ہیں جو ان کے نظریات سے زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہے البتہ عام انتخابات میں وہ اپنے ہی امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں۔ وسکونسن میں سالہا سال تک ری پبلکن کو عام انتخابات جیتنے کا یقین رہا چنانچہ بنیادی انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کے بہت سے ووٹر ری پبلکن کو ووٹ دیتے تھے اور ایسے امیدوار کو دیتے تھے جو ڈیموکریٹک پارٹی کے خیالات اور رویے کے مطابق نظر آتا ہو جس زمانے میں ریاست میں لافولیٹ کا طوطی بول رہا تھا آزاد خیال ڈیموکریٹ ووٹروں نے ری پبلکن انتخاب میں حصہ لیا تھا اور اتنے زیادہ ووٹ پڑے تھے کہ ڈیموکریٹک ووٹر جب اپنے امیدواروں کے حق میں ووٹ دیتے ہیں تو ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہوتی۔

بنیادی انتخاب کے امیدوار: ری پبلکن یا ڈیموکریٹک پارٹی کے ابتدائی بیلیٹ میں نام شامل کرانے کے سلسلے میں ہر ریاست میں کچھ قاعدے اور قوانین مقرر ہیں لیکن عام طور پر کوئی بھی عورت یا مرد ایک درخواست پر مقررہ تعداد میں لوگوں کے دستخط کرا کے پیش کر دیتا ہے اور مختلف عہدوں کی نامزدگی کے لئے اپنا نام شامل کرا سکتا ہے۔ دستخطوں کی تعداد کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ جس عہدے کی نامزدگی مطلوب ہے اس کی اہمیت کیا ہے اور اس میں کتنے ووٹر حصہ لیں گے۔

مقامی عہدوں کے لئے صرف چند ہی لوگوں کے دستخط بہت ہیں لیکن ریاست کے اعلیٰ مناصب کے لئے ایک ہزار یا اس سے بھی زائد دستخطوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے یہ درخواست متعلقہ افسر کو پیش کر دی جاتی ہے۔ اور امیدوار کا نام فہرست میں شامل ہو جاتا ہے بعض ریاستوں میں انتخابات کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے کہ درخواست دہندہ اپنی درخواست کے ساتھ معمولی فیس بھی ادا کرے۔ بعض ریاستوں میں مثلاً امیدوار کو فیس دینا تو درکنار، درخواست دینے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ متعلقہ افسر سے زبانی کہہ دیتا ہے کہ فلاں عہدے کا امیدوار بننا چاہتا ہے اور بس اتنا ہی کافی ہے۔

بڑے شہروں کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جو لوگ اپنے نام پیش کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں وہی سب سے زیادہ دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ ریاست اور کانگریس کی نشستوں کے لئے تو پارٹی کے لیڈر ایسے لوگوں کو سامنے لاتے ہیں جن کی وہ حمایت کرنا چاہتے ہیں۔ سینیٹ یا دوسرے بڑے اداروں کی نشستوں پر جو لوگ ایک بار منتخب ہو جاتے ہیں ان سے بھی کہا جاتا ہے کہ وہ نامزدگی کا کاغذ داخل کر دیں۔ بعض اوقات سیاسی لیڈر میئر کے انتخاب کے لئے کسی ایسے دولت مند تاجر کو کھڑا کرتے ہیں جو اپنی سخاوت اور رشیدہ نوازی کی وجہ سے عام شہرت کا مالک ہوتا ہے۔ عام طور پر پارٹی کے لیڈر خود اپنا نام شامل نہیں کراتے۔ وہ عموماً پیش قدمی وہی شخص کرتا ہے جو کسی خاص عہدے کا طلبگار ہوتا ہے۔

طریقۂ انتخاب ثانی:۔ بنیادی انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ پانے والا

کامیاب قرار دے دیا جاتا ہے خواہ اسے ووٹوں کی اکثریت حاصل نہ ہوئی
ہو۔ البتہ جنوبی ریاستوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے —
جنوب میں ان انتخابات کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ
ڈیموکریٹک بنیادی انتخاب میں جو لوگ جیت جاتے ہیں انھیں عام انتخابات
میں کامیابی کا پروانہ مل جاتا ہے کیونکہ ان علاقوں میں ایک ہی پارٹی کا غلبہ
ہے اور یہاں بنیادی انتخابات کے ضابطے بھی دوسری جگہوں کے مقابلے
میں سخت ہیں جنوبی ریاستوں میں کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ امیدوار
کو اکثریت کا ووٹ حاصل ہو۔ اگر کسی بھی امیدوار کو مجموعی ووٹوں کی اکثریت
حاصل نہیں ہوتی تو سب سے زیادہ ووٹ پانے والے دو امیدواروں کے
درمیان دوبارہ مقابلہ ہوتا ہے — چونکہ بڑے عہدوں اور نشستوں
کے لئے چار سے سات تک ممتاز امیدوار میدان میں آتے ہیں اس لئے
کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ کسی امیدوار کو اکثریتی ووٹ نہیں ملتا اور انتخاب
ثانی ضروری ہو جاتا ہے — ہاں اگر ان دو میں سے ایک امیدوار مقابلے
سے دستبردار ہو جائے تو اس کے حریف کو کامیاب قرار دے دیا جاتا ہے۔

بنیادی انتخاب سے پہلے کنونشن

ساڑھے چار سو برس پہلے پارٹی بازی
کے خلاف عام نفرت پھیلی ہوئی تھی
لیکن اب اس کا دور ختم ہو گیا اور سیاسی پارٹیوں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل
کرنے کے لئے مناسب اقدامات کئے ہیں۔ جن ریاستوں میں پارٹی کی
قیادت مستحکم ہے وہاں ایوان، سینیٹ اور دوسرے منصبوں کے

امیدواروں کی نامزدگی کے لیے پارٹیوں کے نمایندے کنونشن منعقد کرتے ہیں۔ اس قسم کی بیشتر ریاستیں مشرق میں ہیں۔

بعض ریاستوں میں قانوناً یا رسماً پارٹیوں کو کنونشن منعقد کرنے کی اجازت ہے۔ ریاست کے تمام حصوں سے لیڈر جمع ہوتے ہیں اور کنونشن میں مختلف عہدوں کے لئے امیدواروں کی ایک فہرست تیار کر لیتے ہیں۔ جو بنیادی انتخاب میں پارٹی کے ممبروں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ دوسرے امیدوار اپنے طور پر ضابطے کے مطابق بیلٹ میں شامل کرا سکتے ہیں۔

پارٹی کے نامزد کردہ امیدوار فائدے میں رہتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ محض کنونشن کی حمایت کے بعد وہ انتخاب جیت جائیں۔

بہر حال انتخاب سے پہلے امیدواروں کے بارے میں پارٹی کے لیڈروں کو رائے ظاہر کرنے کا کوئی طریقہ سے موقع دیا جاتا ہے۔ کنکٹیکٹ میں یہ قاعدہ ہے کہ کنونشن کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی شکست خوردہ امیدوار جسے کنونشن کے بیس فیصد ووٹ حاصل ہوں۔ بنیادی انتخاب میں حصہ لینے کا خواہشمند ہو تو اسے موقع دیا جاتا ہے۔ ابھی تک کسی نے کنونشن کے فیصلے کو چیلنج نہیں کیا ہے البتہ ایک بار ایک ممتاز عوامی لیڈر نے کنونشن کے سامنے اعلان کیا تھا کہ اسے نامزد نہ کیا گیا تو وہ عام انتخاب کا مطالبہ کرے گا۔ اور کنونشن کو اس کے سامنے جھکنا پڑا۔

ایک اور طریقہ آیووا میں رائج ہے وہ یہ کہ بنیادی انتخاب پہلے ہو جاتا ہے اور کنونشن بعد میں۔ اگر کسی امیدوار کو مجموعی ووٹوں میں سے ۳۵

فیصد سے زائد ووٹ نہیں ملے تو کنونشن منعقد ہوتا ہے اور انتخاب میں
سے سب سے زائد ووٹ پانے والے امیدواروں میں سے ایک کو چن لیا
جاتا ہے۔ یہ طریقہ جنوبی ریاستوں کے "انتخاب ثانی" سے ملتا جلتا ہے لیکن
چونکہ اس امیدوار کو بعد میں بڑی پارٹیوں کے امیدواروں سے انتخاب لڑنا
ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا نام ووٹ دینے والے پارٹی ممبروں کو بھیجنے کی
بجائے کنونشن کے نمائندوں کو پیش کر دیا جاتا ہے۔

براہ راست طریق انتخاب پر تبصرہ

بنیادی انتخاب کے علمبرداروں کا مقصد یہ تھا کہ دولتمند
اور اقتدار پسندوں کا غلبہ ختم ہو اور خود پارٹی کا اثر بھی کم ہو جائے
دیہی علاقوں اور چھوٹے شہروں کے لوگ پارٹیوں پر اعتماد نہیں کرتے
تھے وہ انھیں شہروں میں رہنے والے لکھ پتی ساہوکاروں اور صنعتکاروں
کا آلہ کار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ عوام کے مفادات کا تحفظ صرف
اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ امیدواروں کی نامزدگی کا حق عوام ہی کو حاصل
ہو۔ ہربرٹ کروّلی اور اس دور کے دوسرے ممتاز مفکروں نے بھی یہی
نعرہ لگایا اور پارٹی بازی کی مخالفت کی ــــ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک
سیاسی پارٹیاں انتخابات پر مسلّط رہیں گی اور جب تک قوم و ملک کی
فلاح و بہبود کی پالیسیاں مرتب کرنے کا فرض وہ انجام دیں گی اس وقت
تک امریکی عوام کی زندگی پرسکون اور خوشحال نہیں بن سکتی۔
لیکن یہ خیالات صحیح نہیں نکلے، بنیادی انتخاب شروع ہونے سے

سیاسی پارٹیاں ختم نہیں ہوئیں اور ملک میں رشوت ستانی اور اقتدار پسندی کا بھی خاتمہ نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ ضرور اثر پڑا کہ اب بدعنوانی کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ اور سیاسی لیڈروں نے بھی اپنے طور طریق مجبوراً بدل دئیے ہیں۔ اس کے علاوہ اب امیدواروں کے انتخاب میں پارٹی کے عام ممبر اپنے لیڈروں سے اپنی بات منواتے ہیں۔ اور چونکہ اب امیدواروں کا فیصلہ لیڈروں کے اختیار میں نہیں رہا۔ اس لئے اب لیڈروں کی جانب سے جو نام پیش کئے جاتے ہیں وہ پہلے کی طرح کے نہیں ہوتے بلکہ دوسری قسم کے لوگ سامنے لائے جاتے ہیں۔

براہ راست انتخاب شروع ہونے کے بعد اقتدار پسند لیڈروں کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ لیکن اس کی اور وجوہات بھی ہیں۔ اب سرکاری افسروں کا انتخاب لیاقت کی بنیاد پر سروس کمیشن کرتا ہے اس لئے دولت مند تاجر لیڈروں کی جس سرپرستی پر بھروسہ کرتے تھے وہ اب باقی نہیں رہی۔ دوسرے عوام کی فلاح و بہبود کے زیادہ سے زیادہ کام حکومت خود کرنے لگی ہے۔ اس لئے لوگ اب بدحالی یا بے روزگاری کی صورت میں سیاسی پارٹیوں کی مدد اور عطیے کے محتاج نہیں رہے۔

شہروں میں اب گنتی کے اقتدار پسندوں کا زور ٹوٹ چکا ہے لیکن پارٹیوں کی ریاستی یا قومی تنظیموں میں کوئی نئی قوت نہیں ہوئی ہے۔ پارٹیوں میں مرکزیت قائم نہیں رہی بلکہ اختیارات کی تقسیم کا دائرہ اور وسیع ہو گیا ہے۔ بعض بڑے شہروں کے سوا، امیدواروں کی نامزدگی پارٹی ہی کی تی

ہے اور عوام کو اپنی پسند کے امیدواروں کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن یہ بات مفید اسی صورت میں ہوتی ہے جب پارٹی ایسے لوگوں کے نام تجویز کرے جنہیں بنیادی انتخاب میں پارٹی کے ممبروں کی اکثریت ووٹ دینا چاہتی ہو۔ پارٹی ممبروں کے ووٹوں کی اس اہمیت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کانگریس کی نشستوں کے لیے جو لوگ منتخب کیے جاتے ہیں وہ ملک کی داخلی پالیسی میں اپنے اپنے علاقوں کے مفادات کا لحاظ رکھتے ہیں اور داخلی مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں یہ لوگ جو روش اختیار کرتے ہیں اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ان مفادات کا کس حد تک خیال رکھا ہے۔

انتخابات

امریکہ میں انتخابات ایک مقررہ مدت کے بعد ہوتے ہیں۔ ایوان نمائندگان کے ممبروں کا انتخاب ہر دو سال پر ہوتا ہے اور سینیٹ کے ممبروں کا چھ سال کے بعد — لیکن سینیٹروں کے انتخابات کی نوعیت یہ ہے کہ سینیٹ کے ایک تہائی ممبر ہر دو سال پر منتخب کیے جاتے ہیں۔ صدر کا انتخاب چار سال پر ہوتا ہے۔ ججوں کے سوا دیگر مقامی اور ریاستی عہدیداروں کا انتخاب ایک سے چار سال تک کے لیے ہوتا ہے۔

کانگریس کے ممبروں اور صدر کے انتخابات نومبر میں پہلے پیر کے بعد پہلے منگل کو ہوتے ہیں۔ بنیادی انتخابات مختلف ریاستوں کے قاعدے قانون کے مطابق سال بھر میں کسی وقت بھی ہو سکتے ہیں۔

انتخابات کے لئے ہر ریاست میں انتخابی ضلعے بنائے جاتے ہیں۔
اور ان کے چھوٹے بڑے ہونے کا انحصار شہروں میں آبادی پر اور دیہات
میں فاصلے پر ہوتا ہے یعنی ایک حلقے میں تو دو ووٹر بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی
تعداد تین ہزار بھی ہو سکتی ہے۔ شہروں میں ووٹنگ مشین استعمال کی جاتی ہے
اور دیہی علاقوں میں ووٹروں کی تعداد نسبتاً کم ہوتی ہے۔ دیہی علاقوں میں
کاغذی پرچیاں ڈالی جاسکتی ہیں۔ ووٹ ڈالنے کے مرکز کے طور پر عام عمارتوں
مثلاً اسکولوں وغیرہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جہاں ایسی عمارت نہیں وہاں
گرجا گھر یا کسی اور عمارت میں اس کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔

ہر حلقے میں انتخابات کی نگرانی کے لئے تین سے نو تک افسر مقرر کئے
جاتے ہیں۔ ان کا تقرر بڑی پارٹیوں کی منظوری کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہ افسر انتخابی
فہرست کو دیکھ کر ووٹروں کی تصدیق کرتے ہیں، ووٹ پڑنے کے وقت نگرانی
کا فرض انجام دیتے ہیں اور بعد میں ووٹوں کی گنتی کرتے ہیں اور یہ اعداد و
شمار ایک اور دفتر کو بھیج دئے جاتے ہیں اور وہاں سے نتائج کا اعلان ہوتا ہے۔

الیکشن افسروں کے علاوہ متعلقہ پارٹیوں کے نمائندے بھی ووٹنگ
کی نگرانی کے لئے موقع پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ نمائندے کسی بھی ووٹر کی
اہلیت پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ووٹر کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے
کہ وہ وہی شخص ہے جس کا نام ووٹروں کی فہرست میں درج ہے۔ بیشتر پولنگ بوتھ
پر ان ایجنٹوں کا کوئی کام نہیں ہوتا اور یہ دراصل اس دور کی یادگار ہیں
جب جعلی ووٹ ڈالنے کا عام رواج تھا۔

ووٹ کی پرچیاں

پرانے زمانے میں عوام بآواز بلند اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور پھر جب پرچیاں ڈالنے کا رواج شروع ہوا تو بھی سیاسی جماعتیں اس کا انتظام خود کیا کرتی تھیں لیکن آبادی مسلسل بڑھتی رہی اور انتخابات میں بدعنوانیوں کی خبریں بھی ملتی رہیں۔ چنانچہ ریاست کی مجلس قانون نے رائے شماری کے لئے "آسٹریلین بیلٹ" خود جاری کرنا شروع کیا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ووٹ خفیہ طریقے پر ڈالے جاتے ہیں، ووٹوں کی ساری پرچیاں ایک طرح کی چھپی ہوئی ہوتی ہیں اور اس کے اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔ بہر حال ہر ریاست کی پرچی دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔

عام طور پر دو طرح کے بیلٹ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایک کے ذریعے ووٹر تمام نشستوں کے لئے ایک ہی پارٹی کے امیدواروں کو ووٹ دے سکتا ہے۔ دوسرا ٹکٹ قابلِ تقسیم ہوتا ہے۔ یعنی اس کے ذریعہ دو یا زیادہ پارٹیوں کو ووٹ دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پارٹی کالم سا بیلٹ جسے انڈیانا بیلٹ بھی کہتے ہیں بہت عام ہے۔ اس میں امیدواروں اور نشستوں کے نام لکھ دئے جاتے ہیں یعنی ڈیموکریٹک پارٹی کے خانے میں پہلے صدارت کے امیدوار کا نام درج ہوتا ہے اس کے بعد سینیٹ کے امیدواروں کا اور پھر بالترتیب دوسرے امیدواروں

کے نام ہوتے ہیں۔ اسی طرح ری پبلکن پارٹی کے خانے میں بھی سب امیدوار کے نام درج ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری پارٹیوں کے امیدواروں کے نام بھی اس میں درج کئے جاتے ہیں۔ ووٹر اگر چاہے تو ایک ہی پارٹی کے تمام امیدواروں کو ووٹ دے سکتا ہے لیکن اگر مختلف نشستوں کے لیے وہ مختلف پارٹیوں کے امیدواروں کو منتخب کرنا چاہے تو ایسا بھی کر سکتا ہے۔ یعنی بعض عہدوں کے لئے وہ ری پبلکن امیدوار کو اور بعض کے لئے ڈیموکریٹ کو بآسانی ووٹ دے سکتا ہے۔ البتہ ایک نشست کے لئے ایک ہی امیدوار کی حمایت کر سکتا ہے۔

بیلٹ کی دوسری قسم مسیاچوسیٹس کے نام سے مشہور ہے اس میں نشستوں کے لحاظ سے اندراج ہوتا ہے یعنی ہر عہدے کے لئے تمام پارٹیوں کے امیدواروں کے نام لکھے ہوتے ہیں مثلاً ایک عنوان ہے۔ "امریکی سینیٹر" اس کے تحت تمام امیدواروں کی فہرست ہوتی ہے۔ اسی طرح ایوانِ نمائندگان" کے تحت ایوان کی نشستوں کے امیدواروں کے نام ہوں گے اسی طرح ووٹر کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ مختلف مناصب کے لئے اپنی پسند اور مرضی کے مطابق آدمی کو ووٹ دے سکے۔

آٹھ فیصدی ریاستوں کے بنیادی اور عام انتخابات میں ووٹنگ مشین استعمال کی جاتی ہے۔ چنانچہ اب ووٹوں کی گنتی میں غلطی اور بددیانتی کا امکان نہیں رہا اور کام بھی بہت جلدی ہوتا ہے۔ یہ مشین اس طرح کام کرتی ہے کہ ووٹر اس میں اپنی پرچی ڈال کر جس

امیدوار کو یا مختلف نشستوں کے لئے جن جن امیدواروں کو ووٹ دینا چاہتا ہے، مشین کا ہینڈل گھما کر اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

ہر ریاست میں اس بات کا بھی انتظام رہتا ہے کہ جو ووٹر کسی معقول وجہ کی بنا پر حاضر نہیں ہو سکتے ان کا ووٹ بھی ڈالا جائے لیکن اس کے لئے مختلف ریاستوں میں مختلف ضابطے مقرر ہیں بعض جگہوں پر یہ قاعدہ ہے کہ اگر آپ بیماری یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے مقررہ تاریخ کو ووٹ ڈالنے کے لئے نہیں آ سکتے تو باقاعدہ انتخابات سے پہلے ہی کسی تاریخ کو ایک خاص قسم کی پرچی کے ذریعہ ووٹ دے سکتے ہیں۔ بعض ریاستوں کے ضابطے بہت سخت ہیں اور جو لوگ خود حاضر نہیں ہو سکتے انھیں ووٹ دینے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال ایسے لوگوں کو مقررہ وقت سے پہلے خاص پرچیاں ضرور حاصل کرنی ہوتی ہیں۔ خانہ پری کے بعد یہ پرچیاں بڑی احتیاط اور پابندی سے الکشن افسروں کو ایک ہفتہ پہلے ہی پہنچا دی جاتی ہیں — عام طور پر باقاعدہ ووٹنگ ختم ہو جانے کے بعد ہی ان "غائبانہ" ووٹوں کی گنتی ہوتی ہے۔

انتخابی مہم کے اخراجات

امریکہ میں پارٹی کے انتظامی اخراجات اور انتخابی مہم کے مصارف

پورے کرنے کے لیے ممبروں سے باقاعدہ چندہ یا امداد نہیں لی جاتی۔ مختلف اداروں اور افراد بھی طور پر پارٹی یا امیدوار کو جو رقمیں دیتے رہتے ہیں اسی سے خرچ پورا کیا جاتا ہے۔ ایوان اور سینیٹ کے امیدواروں کو پارٹی کی ریاستی یا قومی تنظیموں سے بھی مالی امداد مل سکتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ امیدوار انتخابی مصارف پورے کرنے کے لئے نجی ذرائع کا سہارا لیتے ہیں۔

کارپوریشنوں اور ٹریڈ یونینوں کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی پارٹی یا امیدوار کو چندہ یا امداد دیں۔ البتہ ایسا کوئی قانون بھی نہیں ہے جو بڑے تاجروں اور صنعتکاروں کو عطیات دینے سے باز رکھ سکے۔ ٹریڈ یونین بھی اپنے ممبروں کے ذریعہ رضاکارانہ طور پر چندہ جمع کراتی ہے تاکہ وہ اپنی پارٹی اور امیدواروں کی مدد کر سکیں۔

متعلقہ قوانین بہت زیادہ سخت نہیں ہیں جس کی وجہ سے کارپوریشنوں اور ٹریڈ یونینوں کو "انتخابی تعلیم و تربیت" کا پروگرام شروع کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس کی وجہ سے متعلقہ پارٹیوں کے اخراجات کم ہو جاتے ہیں۔ اس پروگرام کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ نئے نئے ووٹروں کی فہرستیں بنائی جائیں اور انتخابی مہم میں ہاتھ بٹانے کے لئے رضاکاروں کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔

انتخابی مہم کے دوران رقوم کی آمد و خرچ کا باضابطہ حساب رکھنے کے سلسلے میں ریاستی اور قومی حکومتیں نگرانی کا فرض انجام

دیتی ہیں۔ مرکزی ضابطوں کے تحت، صرف ان رقموں کا حساب دیکھا جاتا ہے جو ایوان اور سینیٹ کے ممبروں اور صدارت اور نائب صدارت کے امیدواروں کی انتخابی مہم سے تعلق رکھتی ہیں۔ صدر اور نائب صدر کے سوا باقی امیدواروں کے مصارف پر ریاستی حکومتیں نظر رکھتی ہیں۔ ان ضابطوں کے تحت نہ صرف آمد و خرچ کی نگرانی ہوتی ہے بلکہ مختلف نوعیت کی بدعنوانی اور ووٹروں پر بیجا دباؤ کا تدارک بھی کیا جاتا ہے مثلاً "ہیچ ایکٹ" کے تحت، ایسے سیاسی لیڈروں سے رقم نہیں لی جا سکتی، جنہیں حکومت سے تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازمین کو بھی قومی نشستوں کی انتخابی مہم میں حصہ لینے کی ممانعت ہے۔ ریاستی اور مرکزی حکومت نے کانگریس کے انتخابات کی مہم میں اخراجات کی ایک حد مقرر کر رکھی ہے۔ چنانچہ امیدواروں کو آمدنی اور خرچ کا حساب دینا پڑتا ہے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

بات یہ ہے کہ رقموں کی آمد و خرچ میں بھی افراد، امیدوار اور مختلف کمیٹیاں سبھی شریک ہوتے ہیں اس لئے یہ پتہ چلانا بہت ہی مشکل ہے کہ کتنی رقم کہاں سے آئی اور کہاں کہاں خرچ کی گئی۔

الیگزنڈر ہیرڈ نے انتخابی مہم کے اخراجات کا نہایت جامع طریقہ پر جائزہ لیا ہے۔ اور اس سلسلے میں امیدواروں کی اطلاعات کے بجائے بڑے پیمانے پر اعداد و شمار کی روشنی میں معاملے پر نظر ڈالی

ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ امریکہ میں فی کس خرچ دوسرے جمہوری ملکوں کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ امیدواروں کی کامیابی کا انحصار انتخابی اخراجات پر نہیں ہوتا۔ اور اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے کہ انتخابی اخراجات بڑے بڑے سرمایہ داروں اور تاجروں کی تجوریوں سے پورے کئے جاتے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ لاکھوں عوام بھی طور پر تھوڑی تھوڑی رقم دیتے ہیں جو جمع ہو کر بہت بڑی رقم بن جاتی ہے۔

دوسرے مفکروں کی طرح ہیرڈ کا بھی یہی خیال ہے کہ انتخابی اخراجات کی حد مقرر کرنے سے کوئی خاص مقصد پورا نہیں ہوتا، ہونا تو یہ چاہیئے کہ آمد و خرچ کے حسابات، دیانت داری اور باقاعدگی کے ساتھ پیش کرنے پر زور دیا جائے کیونکہ یہی چیز زیادہ اہم ہے۔

الگزنڈر ہیئر صدر کے اس کمیشن کے چیرمین تھے جو انتخابی مہم کے مصارف کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ کمیشن نے ان کی کئی اصلاحی سفارشوں پر غور کیا۔ کمیشن کی سب سے اہم سفارش یہ تھی کہ عطیات میں حصہ لینے والوں کو دس ڈالر تک ٹیکس کی معافی دے دی جائے تاکہ عام لوگ پارٹی کے اخراجات میں زیادہ حصہ لیں اور بڑی بڑی رقمیں دینے والوں کا عمل دخل کم ہو جائے۔

کیلیفورنیا اور مانٹن سوٹا دو ایسی ریاستیں ہیں جہاں انتخابی

مہم میں چندہ دینے والوں کو ٹیکس کی رعایت یا چھوٹ دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ کچھ ہی عرصے پہلے شروع کیا گیا ہے اس لئے ابھی صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس رعایت کی وجہ سے چندہ دینے والوں کی تعداد پر کیا اثر پڑا ہے۔

خلاصہ

گزشتہ صفحات میں بنیادی اور عام انتخابات کے بارے میں جو تفصیلی بحث کی گئی ہے اس کو جامع اور مختصر الفاظ میں پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انتخابات کے طریقے کار پر دو زاویوں سے نظر ڈالی جائے۔ پہلے ہم دیکھیں گے کہ کانگریس کے امیدوار پر اس طریقہ کار کا کیا اثر پڑتا ہے اور پھر ایک شہری کے نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیں گے۔

جس نوجوان کے دل میں ملک کے مسائل کو حل کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ کانگریس کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے اس کا پہلا کام یہ ہے کہ براہ راست بنیادی انتخاب کے سرکاری بیلٹ میں اپنا نام شامل کرائے کیونکہ پارٹی کے امیدوار اسی سطح پر نامزد کئے جاتے ہیں۔ داخلے کے کاغذات وہ خود داخل کرتا ہے اور پھر اپنے ساتھیوں اور حامیوں کی مدد سے ایسی مہم چلاتا ہے کہ بنیادی انتخاب جیت لے۔ مہم کے سلسلے میں وہ دو چار آدمیوں کو ملازم بھی رکھ سکتا ہے لیکن عام طور پر دوستوں اور خیر خواہوں کی رضاکارانہ خدمات کام آتی ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہوتی ہے۔

کیونکہ ان کے پاس کافی وقت ہوتا ہے اور وہ امیدوار کے حامیوں کے نام درج کراتی پھرتی ہیں۔ اور انتخاب کے دن انھیں گھیر کر پولنگ اسٹیشن پر لے آتی ہیں۔ امیدوار چاہے تو اس مہم میں ضلع کے پارٹی لیڈروں کا تعاون بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اگر ان کا تعاون حاصل ہو تو مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ خلاف ہوں تو بھی کوئی امیدوار بنیادی انتخاب کے حق سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔

مہم کے دوران ریڈیو اور ٹیلیویژن پر تقریریں ہوتی ہیں اور کتابچے اور اشتہارات بھی چھاپے جاتے ہیں۔ یہ تمام اخراجات امیدوار اور اس کے دوست احباب برداشت کرتے ہیں۔ امیدوار ان دنوں میں صبح سے شام تک تقریریں کرتا رہتا ہے اور اپنے ووٹروں کی خوشنودی اور حمایت حاصل کرنے کے لئے میل جول بڑھاتا ہے۔ انتخاب کے دن اس کے رضاکار ساتھی تمام ووٹروں کو پولنگ اسٹیشن پر لانے اور ووٹ دینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ انتخابات کے دوران دیکھ بھال کا کام کرتے ہیں اور لوگوں کو امیدوار کے پروگرام سے آگاہ کرتے ہیں۔ شام کو جب پولنگ ختم ہو جاتا ہے تو دوست احباب امیدوار کے دفتر میں جمع ہوتے ہیں اور نتیجے کا انتظار کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ضلع میں اہم پارٹی لیڈروں کی حمایت اور تعاون کے بغیر بھی امیدوار نامزد ہو جاتا ہے اور اسی نشست کے لئے کھڑے ہونے والے پارٹی کے تین چار دوسرے امیدواروں کو کچھ ووٹوں سے۔

شکست دے دیتا ہے۔
نامزدگی کا پروانہ ملنے کے بعد سے تمام طبقوں اور پارٹی لیڈروں کا تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔ کل تک جو لوگ اس کے خلاف تھے اب وہ بھی نومبر کے عام انتخابات میں دوسروں کے مقابلے میں اس کی حمایت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ پہلی بار علاقائی، ریاستی یا قومی تنظیموں سے مالی امداد کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ریاستی اور قومی پارٹیاں بنیادی انتخاب میں دخل نہیں دیتیں۔ اور ضلع کے لیڈر دوسرے امیدوار کی حمایت بھی کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ بنیادی انتخاب میں نامزدگی حاصل کر لیتے ہیں وہ سب کی مدد اور حمایت کے مستحق بن جاتے ہیں۔
کانگریس کا امیدوار اپنا دفتر تو خود ہی چلاتا ہے لیکن پارٹی آفس سے اسے کچھ مدد ملنے لگتی ہے۔ امیدواروں کے حامی اور ساتھی اس کے حق میں مہم جاری رکھتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے کتابچے اور اشتہارات وغیرہ تقسیم کرتے ہیں۔ یہ مہم بھی بنیادی انتخاب کی مہم کی طرح ہوتی ہے البتہ اب اسے پارٹی کے ان امیدواروں سے بھی رابطہ قائم کرنا ہوتا ہے جو نومبر کے انتخابات میں دوسری نشستوں کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس انتخاب میں بھی نتیجہ کا اسی طرح انتظار ہوتا ہے لیکن اب دوسری نشستوں کے امیدواروں کے نتائج بھی دیکھنے ہوتے ہیں۔ اگر وہ منتخب ہو جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ

آیندہ جنوری میں جب کانگریس کا اجلاس شروع ہوگا تو وہ دستور کے تحت اپنی نشست سنبھال لے گا۔

ایوان اور سینیٹ کی نشستوں کے انتخابات ہوں یا دوسرے ریاستی عہدوں کے۔ انتخاب کا طریقہ کار بنیادی طور پر ایک ہی رہتا ہے۔ البتہ نشست کی اہمیت کے اعتبار سے ووٹروں کا حلقہ چھوٹا یا بڑا ہو سکتا ہے لیکن نشست کوئی بھی ہو اس کی سرگرمیاں اور پارٹی ممبروں اور لیڈروں سے اس کے تعلقات کی نوعیت ایک سی رہتی ہے۔

ووٹر کے نقطۂ نظر سے نامزدگی اور انتخاب کا نظام عمل یہ ہے کہ اگر وہ خفیہ بنیادی انتخاب میں امیدوار کی نامزدگی میں حصہ لینا چاہتا ہے تو اس کا کام یہ ہے کہ الیکشن افسر کے دفتر میں نہ صرف اپنا نام اور پتہ درج کرائے بلکہ کسی پارٹی سے اپنی وابستگی کا اعلان بھی کرے۔ جب بنیادی انتخابات شروع ہوتے ہیں تو وہ خفیہ بیلٹ کے ذریعے ہر نشست اور عہدے کے لئے ان لوگوں کے حق میں رائے دیتا ہے جنہیں وہ پارٹی کا امیدوار نامزد کرنا چاہتا ہے۔ اسی سال نومبر میں وہ دوبارہ پولنگ اسٹیشن جاتا ہے اور اپنی پارٹی اور مخالف پارٹی کے امیدواروں کے مقابلے میں اپنی پسند کے امیدوار کو ووٹ دیتا ہے البتہ چھ ریاستوں میں بنیادی انتخاب کا طریقہ رائج ہے اور وہاں ووٹر کو الیکشن افسر کے سامنے کسی پارٹی سے اپنی وابستگی کا اعلان نہیں کرنا پڑتا اسے تمام پارٹیوں کے امیدواروں کو ووٹ دینے کی پرچیاں مل جاتی ہیں لیکن وہ ان میں سے صرف ایک پارٹی کے امیدواروں کی نامزدگی کے حق میں اپنا ووٹ ڈال سکتا ہے۔

۷

صدر کا انتخاب

امریکی عوام اپنے اعلیٰ ترین سیاسی ترجمان یعنی صدر کا جس انداز سے انتخاب کرتے ہیں وہ امریکہ کے انتخابی طریقہ کار کی ایک منفرد خصوصیت ہے۔ شروع ہی سے اس ملک میں اور بیرونی ملکوں میں بھی امریکی صدر کے انتخاب کے طریقہ کار پر نکتہ چینیاں ہوتی رہی ہیں اور اس طریقہ کار کو بدلنے کے لئے جتنی ترمیمیں پیش ہوئیں اتنی دستور کے کسی اور حصے کے بارے میں نہیں ہوئیں۔ یوں تو اس قسم کی ترمیمیں ہمیشہ امریکی کانگریس میں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن چہار سالہ صدارتی انتخاب کے دوسرے سال ان کی تعداد نمایاں طور پر بڑھ جاتی ہے۔ بعض ترمیموں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ صرف طریقہ کار کے آخری مرحلے یعنی انتخابی ادارے میں تبدیلیاں کی جائیں اور بعض پارٹی کے امیدواروں کی نامزدگی کا طریقہ بدلنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کچھ ترمیمیں اس مقصد کے لئے پیش کی جاتی ہیں کہ سارے انتخابی نظام میں ردوبدل ہونا چاہئے۔

بہرحال اس قسم کی تمام نکتہ چینیوں کے باوجود صدارتی انتخاب کا طریقہ کار اب تک وہی ہے جو سوا سو برس پہلے تھا۔ دستور کی منظوری کے پندرہ سال بعد، انتخابی ادارے میں اس خیال سے ترمیم کی گئی تھی کہ نئی سیاسی پارٹیوں کے لئے گنجائش پیدا کی

جاتے ہے۔ کنونشن منعقد کرنے کا طریقہ (جس میں امیدوار نامزد کئے جاتے ہیں) نیشنل ری پبلیکن نے ۱۸۳۱ء میں اختیار کیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے یہ طریقہ ۱۸۳۲ء میں اور اس زمانے کی ایک اور بڑی پارٹی وھگس (Whigs) نے ۱۸۴۰ء میں اپنایا تھا، اُس وقت سے اب تک اس کی تنظیم و طرز عمل میں بہت ہی کم ردّ و بدل ہوا ہے — ڈیموکریٹک پارٹی سے قطع نظر، قومی کنونشن، امریکہ میں قدیم ترین سیاسی ادارہ ہے جو اب تک اُسی طرح کام کر رہا ہے اور آیندہ بھی کنونشن کی موجودہ شکل بدلنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

امریکہ میں نامزدگی کا کنونشن بڑی حد تک اُنیسویں صدی کی یادگار ہے۔ اب بھی بہت سی ریاستیں کنونشن ہی میں اپنے تمام افسروں، گورنروں اور امریکی سینیٹروں کو نامزد کرتی ہیں جب کہ دوسرے امیدواروں کا انتخاب براہ راست کیا جاتا ہے۔

نیویارک، انڈیانا، رہوڈ آئلینڈ اور کنکٹیکٹ ریاستوں میں نامزدگی کے جو کنونشن ہوتے ہیں وہ بالکل اُسی انداز کے ہوتے ہیں۔ جیسے صدر اور نائب صدر کو نامزد کرنیوالا، قومی کنونشن — ایک بار کسی نے ان کنونشنوں کو "روئے زمین کا عظیم ترین تماشا" قرار دیا تھا لیکن دوسرے لوگوں نے اس پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ اس صدی کے شروع میں اوسٹروگوسکی (Ostrogorski) نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ری پبلیکن کنونشن میں صدارت کے اُمیدوار کا نام بالکل اسی طرح نمودار ہوتا ہے جیسے قرعہ اندازی میں کسی کا نام — لیکن اگر آپ کنونشن کے مناظر سے قطع نظر، تمام سابق امریکی صدروں پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ سب لوگ چاہے عظیم انسان نہ رہے ہوں۔ بہرحال یہ سب بڑی محترم شخصیتیں تھیں۔"

اوسٹروگورسکی نے یہ خیال کوئی پچاس برس قبل ظاہر کیا تھا لیکن یہ جزوی طور پر آج
بھی درست ہے یعنی کنونشن میں محترم شخصیتیں نامزد کی جاتی ہیں۔ البتہ ان کے انتخاب کو
قرعہ فال کہنا درست نہیں کنونشن میں ہنگامے اور تماشے تو ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن کنونشن
سے پہلے مہینوں اس کے لئے مناسب تیاری، گفت و شنید اور دوڑ دھوپ کی جاتی ہے
اور سچ تو یہ ہے کہ کنونشن منعقد ہونے سے پہلے ہی صدارتی امیدواروں کی تعداد ایک یا زیادہ
سے زیادہ دو تین رہ جاتی ہے۔ کنونشن میں نمائندوں کی ہنگامہ آرائی اب بھی دیکھنے اور
سننے میں آتی ہے لیکن اسے محض تماشا سمجھ لینا ٹھیک نہیں۔

ملک میں کسی بڑی پارٹی کے قومی کنونشن کا اعلیٰ ترین اقتدار و اختیار مسلّم ہوتا ہے
اور کنونشن بعض اہم فرائض انجام دیتی ہے۔ اس میں صدر اور نائب صدر کے عہدوں کے
لئے پارٹی کے امیدوار کی نامزدگی ہوتی ہے، اور اس میں پارٹی کا وہ منشور مرتب اور
منظور کیا جاتا ہے جسے صدر اور نائب صدر کے عہدوں کے نامزد امیدوار کم از کم
انتخابی مہم کے دوران قبول کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں پر یہ پابندی عائد نہیں ہوتی
کیونکہ پارٹی وفاقی نوعیت کی ہوتی ہے اور اس کے اختیارات ریاستی اور مقامی ادارو
ں میں منقسم ہوتے ہیں۔ کانگریس کے ممبر اور ریاستی تنظیموں کا کام کرنے والے ممبر اس منشور کو بس
اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جو ان کے حلقے والوں کی خواہشوں اور خود ان کے نظریات و تصورات
کے مطابق ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہارنے والی پارٹی بعد میں فاتح پارٹی کے منشور کے عہد و پیماں
اور وعدوں کا حوالہ دیکر سب سے زیادہ شور مچاتی ہے اور وہ بتانا چاہتی ہے کہ متعلقہ پارٹی نے
انتخابی منشور میں جو وعدے کئے تھے انہیں پورا نہیں کر سکی ہے۔

اجتماعات کا نظام

یوں تو کنونشن پر خامی لیے دیے ہوتی رہتی ہے لیکن یہ ایک بڑی جمہوری اصلاح کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ شروع میں صدارتی امیدوار کا انتخاب کانگریس کے پارٹی ممبر کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۰ء تک جب کانگریس میں ایک ہی پارٹی کو غالب اکثریت حاصل رہی اس وقت تک یہ طریقہ نہایت آسانی اور خوبی سے رائج رہا۔ لیکن جب ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پورے ملک کی رائے عامہ کی ترجمانی کی اہل نہ رہی تو کانگریس کے ممبر نامزدگی کے اختیار سے محروم ہو گئے۔ آخری بار ۱۸۲۴ء میں اس طریقے کو آزمانے کی کوشش کی گئی تو ناکامی ہوئی۔ ایوان نمائندگان کے سامنے قطعی انتخاب کے لیے تین نام پیش کیے گئے تھے لیکن کسی کو تائید حاصل نہ ہو سکی کیونکہ کسی کو ووٹوں کی اکثریت نہ مل سکی۔

چار سال کے بعد جنرل اینڈریو جیکسن کے حامیوں نے سوچا کہ ڈیموکریٹک پارٹی ان کو ہر ریاست میں نامزد کرے گی۔ کبھی ان کا نام ریاستی مجلس قانون ساز کی قرارداد کے ذریعے پیش کیا گیا کبھی ریاستی کنونشن میں اور کبھی دوسرے ذرائع سے، لیکن ہر جگہ وہ پارٹی کے نامزد امیدوار تھے۔ ہر ریاست میں عوام کے سامنے امیدوار کا نام الگ مختلف طریقوں سے پیش کرنے کا طریقہ ٹھیک نہیں تھا۔ ۱۸۳۲ء میں ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنا پہلا قومی کنونشن بالٹی مور میں منعقد کیا۔ آٹھ برس کے بعد وہگس نے بھی اپنے امیدواروں کی نامزدگی کے لیے قومی کنونشن بلایا۔ اگلے سولہ برسوں میں کنونشنوں کی تنظیم اور طریق کار میں معمولی رد و بدل ہوا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں کنونشن کی تنظیم اور طریق کار نے ایک مستقل شکل بن گئی اور اس وقت سے اسی

اندازہ بہت کم ہے۔

کنونشن میں کون شرکت کرتا ہے

شروع ہی سے کنونشن میں شرکت کرنے والے امیدواروں کی تعداد کا انحصار اس بات پہ رہا ہے کہ ایوان نمائندگان اور سینیٹ میں ہر ریاست کے کتنے امیدوار ہیں۔ کافی عرصے تک ہر ریاست کو یہ اجازت تھی کہ کانگریس میں اس کے جتنے ممبر ہیں ان کی دوگنی تعداد میں نمائندے بھیجے۔ کبھی کبھی خاص طور پہ ڈیموکریٹک کنونشن میں ریاستی نمائندوں کی تعداد اس سے دوگنی ہو جاتی تھی۔ جتنے ووٹ ریاستوں کو دیئے جاتے تھے لیکن ہر امیدوار کو نصف ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے لئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ریاستی وفد علاقائی تنظیم کے تحت اپنے تمام ووٹ اسی امیدوار کو دیتے تھے جسے بیشتر وفدوں کی حمایت حاصل ہوتی تھی۔ ری پبلیکن چونکہ علاقائی اصول کے خلاف ہیں۔ اس لئے وہ دونوں کی تقسیم کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

ری پبلیکن کنونشن کے مندوبین

شروع میں تو معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس میں ممبروں کی تعداد کی بنیاد پر کنونشن میں نمائندے بھیجنے کا طریقہ منصفانہ ہے لیکن ریاستوں کی سیاسی روش کو ذہن میں رکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ طریقہ بڑا غیر منصفانہ تھا جنوبی ریاستوں نے ری پبلیکن صدارتی انتخاب میں کبھی ووٹ نہیں دیئے لیکن انھیں کنونشن میں اتنے ہی ووٹ دینے کا حق حاصل تھا جتنا شمالی ریاستوں کو جو ہمیشہ ری پبلکن امیدوار کی حمایت کرتی ہیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

آخر کار ۱۹۱۶ء میں شمال کے کچھ ری پبلکن نمائندوں نے جنوب کے بعض ری پبلکن علاقوں کی ضرورت سے زیادہ نمائندگی کے خلاف بغاوت کر دی اور یہ طے پایا کہ جو ضلع ری پبلکن امیدوار کو ساڑھے سات ہزار سے کم ووٹ دیگا وہ دو کی بجائے صرف ایک نمائندہ کنونشن میں بھیج سکے گا۔ بعد میں ووٹوں کی تعداد دس ہزار تک بڑھا دی گئی۔ اس نئے قاعدے کی وجہ سے ۱۹۱۶ء میں جنوبی وفود اپنے ایک تہائی ارکان سے محروم ہو گئے اور جب ووٹوں کی تعداد بڑھی تو ان کے نمائندے اور بھی کم ہو گئے اس کے باوجود جنوب کو تناسب سے زیادہ نمائندگی حاصل رہی۔ اس کے بعد ری پبلکن پارٹی نے ضلعوں کو نمائندگی سے محروم کر دیا۔ اور نمائندگی کے لئے یہ شرط لگائی کہ انہوں نے پچھلے انتخابات میں ری پبلکن امیدوار کو کم سے کم ایک ہزار ووٹ دیئے ہوں۔ ۱۹۳۶ء میں ایک مندوب کے لئے کم سے کم ووٹوں کی تعداد بڑھا کر دو ہزار کر دی گئی۔ بہرحال اب جنوبی ریاستوں نے ڈیموکریٹک پارٹی کی روایت توڑ دی ہے اور بیشتر صدارتی انتخابات میں، زیادہ تر ضلعوں سے ری پبلکن پارٹی کو دس ہزار سے زیادہ ووٹ ملتے ہیں چنانچہ آجکل جنوبی ریاستوں کے کم سے کم چار مندوبین ہوتے ہیں (ہر سینیٹر کے دو دو) اور ہر انتخابی ضلع سے بھی دو ایک نمائندے ہوتے ہیں جن کا انحصار گزشتہ انتخابات کے ری پبلکن ووٹوں پر ہوتا ہے۔

جو ریاستیں ری پبلکن پارٹی کے صدارتی امیدوار کی تائید کرنے میں ناکام رہتی ہیں، پارٹی ان کے ووٹوں کی تعداد محدود کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ پارٹی ایسی ریاستوں کو کچھ بونس ووٹ دیتی ہے جنہوں نے ری پبلکن گورنروں یا سینیٹروں کا انتخاب کیا ہو یا گزشتہ انتخابات میں پارٹی کے صدارتی امیدوار کو غالب اکثریت سے ووٹ

فیصد ہوں۔ سنہ ۱۹۶۰ء کے ریپبلکن کنونشن میں پورے ملک کے ایک ہزار تین سو اکتیس (۱۳۳۱) مندوبین شریک ہوئے تھے۔

ڈیموکریٹک کنونشن کے مندوبین سنہ ۱۹۳۶ء تک ڈیموکریٹک پارٹی ریاستوں کو صرف کانگریس میں نمائندگی کی بنیاد پر نمائندگی کا حق دیتی رہی ہے۔ لیکن سنہ ۱۹۳۶ء میں پارٹی نے ایک صدی پرانا یہ اصول ترک کر دیا کہ صدارتی امیدوار کو کنونشن میں کم سے کم دو تہائی ووٹ ملنے چاہئیں۔ اس طرح جنوبی ریاستوں کے مندوبین کو ایک طرح کا جو جزوی حق تنسیخ حاصل تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس نقصان کی تلافی کے لئے یہ کیا گیا کہ جن ریاستوں نے سابقہ انتخابات میں ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار کی حمایت کی ہے انھیں دو بونس ووٹ دیئے جائیں۔ بعد میں ان کی تعداد چار کر دی گئی۔ پھر ڈیموکریٹک سینیٹروں اور گورنروں کا انتخاب کرنے والی ریاستوں کو کچھ اور ووٹ دیئے گئے اور آخر کار سنہ ۱۹۵۰ء کی مردم شماری کے بموجب حلقہ بندی میں رد و بدل ہوا تو تمام ریاستوں کو کنونشن میں نمائندے بھیجنے کا حق دیا گیا۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں ڈیموکریٹک کنونشن میں ایک ہزار پانچ سو اکیس نمائندے شریک تھے۔

بونس سسٹم بونس سسٹم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ کم آبادی والی ریاستوں کو تناسب سے زیادہ نمائندگی حاصل ہو گئی۔ یعنی یوں تو دونوں پارٹیوں کے کنونشن میں تناسب زیادہ ہوتا ہے لیکن ڈیموکریٹک کنونشن میں سب سے زیادہ نمائندگی ملتی ہے۔ مثلاً یہ کہ وایومنگ (Wyouing) اور نوادا (Nevada) کو آبادی کے لحاظ سے ایوان نمائندگان میں صرف ایک نمائندہ اور دو سینیٹر منتخب کرنے کا

حق ہے۔ لیکن ان ریاستوں نے ڈیموکریٹک سینیٹروں اور گورنروں کا انتخاب کیا تھا۔ اس لئے انھیں آٹھ بونس ووٹ دیئے گئے اور چھ ووٹ ویسے ہی ان کے تھے کیونکہ کانگریس میں ان کے تین تین امیدوار ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ضرورت سے زیادہ بونس ووٹ تھے بعض گنجان آبادی کی ریاستوں کو بھی بونس ووٹ دیئے گئے لیکن انھیں ان دو ریاستوں کے مقابلے میں کم فائدہ ہوا۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ کنونشن میں چھوٹی ریاستوں کو تناسب سے زیادہ ووٹ مل جائیں لیکن ان کی اہمیت زیادہ نہیں ہوتی۔ مثلاً ۱۹۶۲ء میں ڈیموکریٹک کنونشن میں کیلفورنیا کا ہر مندوب تقریباً ۳۳ ہزار آبادی کی نمائندگی کرتا تھا۔ جب کہ نواڈا کا نمائندہ اسی انتخابات میں ڈھائی ہزار سے بھی کم آدمیوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس کے باوجود کیلیفورنیا، نیویارک، الینیس، پنسلوینیا اور دوسری ریاستیں کنونشن پر چھائی رہیں۔ ان کے غلبے کی وجہ یہ تھی کہ نمائندے یہ سمجھتے تھے کہ صدارتی امیدوار کی کامیابی کا انحصار صنعتی ریاستوں کے بڑے وفدوں کی حمایت یا مخالفت پر ہوتا ہے اور بڑی ریاستوں کی مدد کے بغیر کوئی صدارتی امیدوار کامیاب ہونے کی امید نہیں رکھ سکتا۔

مندوبین

دونوں قومی کنونشنوں میں کانگریس کے کچھ ممبر شامل ہوتے ہیں۔ لیکن کنونشن میں سب سے زیادہ اہمیت پارٹی کے تنظیمی اور انتظامی امور کو دی جاتی ہے وفدوں کے سربراہ عام طور پر متعلقہ ریاستوں کے گورنر ہوتے ہیں جو پارٹی کے ممبر

ہوتے ہیں۔ اگر نمایندوں میں سے کچھ صدارتی امیدواروں کی صف میں پیش پیش ہوتے ہیں تو ایسے لوگ نمایندے کی حیثیت سے نہیں آتے۔ روایت یہ ہے کہ انھیں اجلاس میں موجود بھی نہیں ہونا چاہئے۔ صدارتی امیدوار کنونشن ہال کے قریب ہی دفتر قائم کر سکتے ہیں یا پھر اپنے اپنے لیڈروں سے ٹیلی فون پر مسلسل رابطہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ خود اجلاس میں شریک نہیں ہوتے۔

نمایندوں کی اکثریت پارٹی کے ممبروں پر مشتمل ہوتی ہے جو عوام میں کوئی امتیازی رتبے کے مالک نہیں ہوتے۔ یہ عموماً ایسے وفادار رکن ہوتے ہیں — جو صدارتی امیدوار کے لئے برسوں تک دوڑ دھوپ کرتے ہیں لیکن خود کسی منصب پر نہیں پہنچتے ان میں ایسے لوگ شامل ہوتے ہیں جو انتخابی مہم کے لئے فراخ دلی سے چندے دیتے ہیں۔ انھیں اس خدمت کے صلے میں کنونشن کا نمایندہ بنا دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ تو مسلسل یہ اعزاز حاصل کرتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ اپنی زندگی میں صرف ایک ہی کنونشن میں شریک ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وفدوں کے لیڈر بڑے جہاں دیدہ ہوتے ہیں اور بہت سی کنونشنوں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ یہی لوگ ووٹوں کے معاملے میں سب سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن وہ وفدوں پر پوری طرح قابو نہیں رکھتے۔

مندوبین کا انتخاب قومی کنونشن کے لئے نمایندوں کا انتخاب یا تو ریاستی کنونشنوں میں ہوتا ہے یا براہ راست انتخاب کے ذریعے آتے ہیں یا پھر دونوں ہی طریقوں سے — جب کنونشنوں میں یہ انتخاب ہوتا ہے تو اکثریتی ووٹ کی بنا پر عمل میں آتا ہے۔ کبھی کبھی صرف کچھ ہی نمایندے ان میں چنے جاتے ہیں۔ اور باقی نمایندوں کی نامزدگی انتخابی حلقوں سے ہو جاتی ہے۔

بعض ریاستوں میں نمایندوں کا چُناؤ ہر انتخابی حلقے میں براہ راست انتخاب کے وسیلے کیا جاتا ہے اور ریاستی امیدواروں کا انتخاب، ریاستی کنونشن میں ہوتا ہے یا کسی بااختیار کمیٹی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

صدارتی امیدواروں کی بنیادی کانفرنسیں قومی کنونشن کے نمایندوں کے انتخاب کا عام طریقہ یہ ہے کہ بنیادی کانفرنسیں ہوتی ہیں جن میں ریاست کے تمام پارٹی کے ووٹر حصہ لیتے ہیں۔ اور کنونشن کے نمایندوں کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صدارتی امیدواروں میں سے کس کو ترجیح دیں گے بنیادی کانفرنسیں ہر ریاست میں مختلف انداز کی ہوتی ہیں۔ کچھ اور باتیں بھی اس سلسلے میں اہم ہیں۔ اگر تمام امیدوار ایسی کانفرنس میں جانے سے انکار کر دیں تو اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ حالانکہ قانون کے تحت ووٹروں کو اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ قومی کنونشن پر اثر انداز ہوں۔ اس کے برعکس اگر ان میں دو ممتاز امیدوار شریک ہو جائیں تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے حالانکہ ووٹروں کو امیدواروں کے انتخاب میں زیادہ دخل نہیں ہوتا بنیادی کانفرنسیں عموماً چار قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

(۱) ایسی کانفرنسیں جن میں ووٹر امیدواروں کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں لیکن نمایندوں کا انتخاب پارٹی کے ریاستی کنونشنوں میں کیا جاتا ہے۔

(۲) ایسی کانفرنسیں جن میں ووٹر نمایندوں کا انتخاب کرتے ہیں اور صدارتی امیدواروں کے بارے میں رائے زنی بھی کرتے ہیں۔ نمایندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُن ہی امیدواروں کی حمایت کریں جنہیں ووٹروں نے ترجیح دی ہو۔

(۳) ایسی کانفرنسیں جن میں کسی ایک امیدوار کو ترجیح دی جاتی ہے نمائندے بھی منتخب کیے جاتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ اسی امیدوار کی تائید کریں۔ جسے ووٹروں نے ترجیح دی ہو۔

(۴) ایسی کانفرنسیں جن میں ووٹر نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں لیکن کسی امیدوار کو ترجیح نہیں دیتے اور یہ خیال بھی نہیں ظاہر کرتے کہ وہ کس امیدوار کی حمایت کرنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جن ریاستوں میں ووٹر نمائندوں پر کوئی پابندی نہیں عائد کر سکتے اور صدارتی امیدواروں میں کسی کو ترجیح دینے کا حق بھی نہیں رکھتے۔ وہاں بنیادی کانفرنسیں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس قسم کی کانفرنسیں الینیس نیویارک اور پنسلوینیا جیسی ریاستوں میں ہوتی ہیں۔ جہاں پارٹی کی مضبوط تنظیمیں قائم ہیں۔ ان ریاستوں میں ری پبلکن پارٹی کے لیڈر، ووٹروں کی منظوری کے لئے نمائندوں کی ایک فہرست پیش کر دیتے ہیں ڈیموکریٹک لیڈر بھی یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔

سب سے اہم کانفرنسیں وہ ہوتی ہیں جن میں ووٹر صرف نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ بلکہ صدارتی امیدواروں کے بارے میں بھی اپنا فیصلہ دیتے ہیں اور نمائندوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ووٹروں کی مرضی اور پسند کے مطابق ووٹ دیں۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ ووٹر امیدواروں کے حق میں اپنی رائے کا اظہار تو اسی وقت کر سکتے ہیں جب وہ اپنی ریاستوں کی بنیادی کانفرنس میں شریک ہوں قانون کے تحت ووٹر کو کتنا ہی اختیار کیوں نہ حاصل ہو لیکن اگر ریاست میں

کوئی ممتاز امیدوار مہم میں حصہ نہیں لیتا تو ووٹر کی ساری اہمیت ختم ہو جاتی ہے
سنہ ۱۹۶۰ء میں پورے ملک میں ری پبلکن نے نکسن کی حمایت کی تھی۔ لہذا کہیں
بھی کوئی خاص بنیادی کانفرنس منعقد ہی نہیں ہوئی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے کئی نامور
امیدوار تھے لیکن انھوں نے نیو جرسی، کیلیفورنیا اور فلوریڈا میں حمایت حاصل کرنے
کی کوشش نہیں کی کیونکہ متعلقہ ریاستوں کے گورنر اپنے آدمی تھے۔ مطلب یہی
ہوا کہ ڈیموکریٹک پارٹی کے لئے گورنر ہی سب کچھ تھا گو گورنر کوئی خاص امیدوار
نہیں تھا لیکن دوسرے امیدوار اس کی مخالفت مول لینا نہیں چاہتے تھے تاکہ
آئندہ موقعوں پر اس کی حمایت سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہ تو غیر ممکن ہے کہ کوئی بھی نامور
امیدوار پارٹی کے کسی لاڈلے امیدوار کو شکست دیدے۔ بہرحال اگر ریاست کے باہر
کے دو تین امیدوار کھڑے ہوں تو ان کے مقابلے میں ریاستی امیدوار کے جیتنے کا امکان
زیادہ ہے اور یہ تو عام قاعدے کی بات ہے کہ وہ اس امیدوار کی حمایت کرے گا جس
نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

بعض ریاستوں مثلاً وسکونسن جہاں عام کانفرنس ہوتی ہے خود پارٹی کے
اندر ہی باہمی مقابلہ شروع ہو جاتا ہے اور ووٹروں کی دلچسپی مسلسل ہو جاتی ہے۔
سنہ ۱۹۶۰ء میں ری پبلکن کی بنیادی کانفرنس میں نکسن کا کوئی حریف نہیں تھا
انھیں کنونشن میں ریاست کے نمائندوں کی حمایت کا پورا یقین تھا نتیجہ یہ ہوا کہ
بہت سے لوگوں نے جو بظاہر ری پبلکن سے تعلق رکھتے تھے ڈیموکریٹک پارٹی
کی ان کانفرنسوں میں ووٹ دیئے جہاں سینیٹر ہمفری اور کینیڈی پارٹی کے امیدوارشپ
کی حمایت کے لئے رسہ کشی میں مصروف تھے۔ ریاست کے جن علاقوں میں کیتھولک

اکثریت تھی۔ وہاں سینیٹر کینیڈی کو اور پروٹسٹنٹ علاقوں میں سینیٹر ہمفری کو زیادہ ووٹ ملے۔

بنیادی کانفرنسوں کی اہمیت

انتخابی تنظیم کے اصلاحی دور میں جب بہت سی ریاستوں میں مقامی افسروں کی نامزدگی کے لئے براہ راست کانفرنسیں منعقد کرنے کی بنیاد پڑی تو صدارتی امیدوار کو بھی اسی طریقے پر نامزد کرنے کی تحریک زور پکڑ گئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں صدارتی امیدوار کی نامزدگی کے لئے بائیس ریاستوں نے براہ راست ووٹ کا کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ عام ہو گیا۔ بعض مصلحوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ایک قومی کانفرنس کی بنیاد ڈالی جائے اور پارٹی کے امیدواروں کی نامزدگی کے کنونشن کو ختم کر دیا جائے۔ یہ تجویز رد کر دی گئی۔ اور سنہ ۱۹۱۶ء میں تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس وقت ۲۶ ریاستوں نے نمائندوں کے انتخاب اور صدارتی امیدوار کے بارے میں ترجیحی رائے کے اظہار کے لئے یہی طریقہ اختیار کر لیا لیکن بعد میں بہت سی ریاستوں نے یہ طریقہ ختم کر دیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں بیس ریاستوں نے صدارتی کانفرنسوں کی بنیاد ڈالی۔

بعض سیاسی رہنماؤں کا یہ خیال ہے کہ بنیادی کانفرنسوں کی وجہ سے صدارتی کنونشن کا رنگ ڈھنگ جمہوری ہو جاتا ہے لیکن بعضوں کی رائے ہے کہ یہ کانفرنسیں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ ایسے لوگوں میں سابق صدر ٹرومین بھی شامل ہیں۔ مسٹر ٹرومین نے ایک بار ایسی کانفرنسوں کے نتیجے کو "دل کی تسکین کا سامان" کہا تھا۔ ان کانفرنسوں کی خوبیوں اور خامیوں سے قطع نظر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

بعض امیدواروں کے حق میں یہ نہایت فیصلہ کن ثابت ہوئی ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں خرابی تو یہی ہے کہ اگر ان میں کسی لائق امیدوار کو نظر انداز کر دیا جائے تو آیندہ اس کے راستے تاریک ہو جاتے ہیں ۱۹۵۲ء میں جب وسکونسن کے شہریوں نے حمایت کرنے سے گریز کیا تو وینڈل ولکی نے ری پبلکن کنونشن سے اپنا نام واپس لے لیا۔ چار سال کے بعد ارگین کے ری پبلکن امیدواروں نے تھامس۔ ای۔ ڈیوی کے حق میں زوردار حمایت کا اظہار کیا تو ہیرولڈ اسٹیس کو دستبردار ہونا پڑا۔ سینیٹر ہمفری ویسٹ ورجینیا میں سینیٹر کینیڈی سے شکست کھانے کے بعد میدان سے نکل گئے۔

بعضوں کے حق میں بنیادی ادارے مفید بھی ہوتے ہیں۔ سب سے نمایاں مثال ۱۹۶۰ء میں سینیٹر کینیڈی کی ہے۔ ویسٹ ورجینیا کی حمایت حاصل ہونے سے پہلے نیو انگلینڈ اور اپنی ریاستوں سے انہیں پارٹی کی زیادہ حمایت حاصل نہیں تھی لیکن ابتدائی مقابلے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ان کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں اور ویسٹ ورجینیا جیسی ریاست میں بھی جہاں پروٹسٹنٹ اکثریت ہے۔ ان کی کیتھولک فرقہ کی وابستگی ان کی کامیابی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکی۔ ریاست میں کامیابی کے بعد ہر ہفتے ان کی حمایت بڑھتی گئی اور آخر کار جولائی میں لاس اینجلز میں ڈیموکریٹک کنونشن نے انہیں نامزد کر دیا۔

البتہ اگر کوئی شخص پہلے صدر رہ چکا ہو تو اس کے معاملے میں ان بنیادی اداروں کی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ پورے ملک میں اس کا سیاسی اثر اتنا ہوتا ہے کہ اسے پارٹی سے نامزدگی کا یقین رہتا ہے اور پارٹی کے لوگ اس کی

حمایت کرتے ہیں اور اس کی کارگزاریوں کی بنا پر انتخاب لڑتے ہیں۔ دوسرے اس قسم کے امیدوار کے حمایتی زیادہ ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کا دورِ حکومت واقعی بہت ناکام ثابت ہوا ہو۔

اجتماعات کی تنظیم

مختلف پارٹیوں کی قومی کمیٹی ہر چار سال بعد قومی کنونشن منعقد کرتی ہے جگہ کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں پہلے ان معاملوں پر غور کیا جاتا ہے کہ مجوزہ شہر میں کتنی سہولتیں میسر ہیں۔ اس شہر کے لوگ اخراجات میں کتنی مدد دیں گے اور اس شہر میں کنونشن منعقد کرنے کے سیاسی اثرات کیا ہوں گے۔ پچھلے برسوں میں بیشتر کنونشن شکاگو اور فلاڈلفیا میں ہوتے ہیں لیکن انتخابات میں کیلیفورنیا کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر ری پبلکن نے سن ۱۹۵۶ء میں اور ڈیموکریٹک پارٹی نے سن ۱۹۶۰ء میں وہاں کنونشن منعقد کیا۔ ممتاز امیدواروں میں سے کسی ایک امیدوار کی پرزور حمایت کرنے والی ریاست میں کنونشن بلانے کا مطلب لیا جاتا تھا کہ اس کے امکانات اور روشن ہو جاتے ہیں جب نہ ملتے ہیں آمد و رفت کی دشواریاں تھیں اس وقت یہ خیال درست ہو۔ لیکن آج کے دور میں کسی خاص جگہ کنونشن منعقد کرنے سے کسی کے لئے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

کنونشن کی کمیٹیاں

کنونشن منعقد کرنے سے پہلے چار ٹری کمیٹیوں کے علاوہ ہوتے ہیں جن کا دائرہ عمل یہ ہے۔ استحقاق، پلیٹ فارم

اور قراردادیں، ضابطے اور طریقہ کار اور مستقل تنظیم، ہر کمیٹی میں ہر ریاست کے دو
دو ممبر شامل ہوتے ہیں اور ان کا انتخاب ریاستی وفد کرتے ہیں جب وہ اپنا بیشتر
کام پورا کر لیتی ہیں تو کنونشن ان کی توثیق کر دیتی ہے۔ عام طور پر پلیٹ فارم اور
قراردادوں کی کمیٹی سب سے اہم ہوتی ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی بعض ریاستوں
کے حریف وفدوں میں نشستوں کے معاملے پر بڑا جھگڑا ہو جاتا ہے اور پھر استحقاق
کمیٹی کا کام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔

پلیٹ فارم کا منشور عام طور پر ایک یا چند آدمی کنونشن سے کئی ہفتے پہلے
ہی تیار کرتے ہیں۔ اگر کنونشن پر ایک امیدوار غالب رہتا ہے تو وہی یہ فیصلہ کرتا ہے
کہ منشور کا پہلا مسودہ کون تیار کرے گا۔ کنونشن سے ایک ہفتہ پہلے کمیٹی کا اجلاس
ہوتا ہے اور اس میں ایسے خواہشمند لوگوں کے بیانات سنے جاتے ہیں جو اس میں کسی قسم
کا رد و بدل چاہتے ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ امریکہ کے خاص مفاد رکھنے والے طبقوں سے
تعلق رکھتے ہیں تاجروں، مزدوروں، کسانوں، اسکولوں اور دوسرے گروپوں کے
نمائندے دونوں پارٹیوں کی کمیٹیوں کے سامنے اپنے اپنے گروپ کا نقطہ نظر پیش
کرتے ہیں۔ دونوں پارٹیاں بڑے غور سے ان کے بیانات سنتی ہیں اور پھر اپنے
اعلان کو آخری شکل دیتی ہیں۔

یہ اعلانات خاصے لمبے چوڑے ہوتے ہیں اور ان میں معاشرے کے ہر طبقے
کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی دستاویزوں میں صاف
گوئی اور بے باکی سے کام نہیں لیا جاتا۔ وعدے کچھ ایسی محتاط زبان میں کئے جاتے
ہیں کہ اس سے معنی و مفہوم کے بہت سے پہلو نکل سکتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی

پارٹی کسی خاص گروپ یا گروپوں کو خوش کرنا چاہتی ہے تو اس کے مفاد کی بات واضح طور پر کہی جاتی ہے۔

ووٹروں کی اکثریت شمال میں اور ریاستوں میں ہی رہتی ہے جو کسی بھی پارٹی کی حمایت کر سکتی ہے۔ بہر حال دونوں پارٹیاں اس بات کی پوری کوشش کرتی ہیں کہ سیاہ فام نسل والوں کے ووٹ حاصل کئے جائیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی پارٹی شہری حقوق کے بل کی مخالف ہے لیکن پارٹی کے تعلقات اور کوشش کے سبب دس پانچ فیصدی ووٹوں کا فرق پڑ سکتا ہے۔ آیندہ صفحات میں ہم بتائیں گے کہ دونوں ہی پارٹیاں نیگرو باشندوں کی حمایت کیوں حاصل کرتی ہیں۔ باوجودیکہ جنوبی ریاستوں کے وفد اس روش کے خلاف ہیں۔ اور جب بات بڑھتی ہے۔ تو پارٹیاں واضح طور پر اعلان کر دیتی ہیں کہ وہ جنوب کی مخالفت کے باوجود نیگرو باشندوں کو سہارا دینا چاہتی ہیں۔ نیگرو باشندوں کی اسی حمایت کی پاداش میں سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد ڈیموکریٹ کے امیدوار کم سے کم چار ریاستوں کی حمایت سے محروم ہو گئے ہیں۔

کنونشن کے منتظمین

قومی پارٹی کا چیرمین کنونشن کا افتتاح کرتا ہے۔ اس کے فوراً بعد کنونشن کا عارضی چیرمین کرسی سنبھالتا ہے اس کا سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ حاضرین کے سامنے ایک لمبی چوڑی تقریر کرتا ہے جس میں اپنی پارٹی کے کارنامے گنواتا ہے اور مخالف پارٹی کی خامیوں اور خرابیوں کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد کنونشن کا مستقل چیرمین اپنی نشست پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہی کنونشن کا سب سے اہم افسر ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس

بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عموماً ایوان نمائندگان میں پارٹیوں کا اعلیٰ ترین افسر اسپیکر یا مخالف پارٹی میں اسی مرتبے کا آدمی چیرمین بنایا جاتا ہے ڈیموکریٹک پارٹی کے سام ریبرن اور ری پبلکن کے جوزف مارٹن متعدد بار اپنی پارٹیوں کے کنونشن کی صدارت کر چکے ہیں۔ سام ریبرن نے آخر میں یعنی ۱۹۶۰ء میں یہ عہدہ سنبھالنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ اپنی ریاست کے اپنے دوست لنڈن بی جانسن کی نامزدگی کے سلسلے میں کام کر رہے تھے۔ سن ۱۹۶۰ء میں مارٹن کی جگہ چارلس ہیلک کنونشن کے چیرمین مقرر ہوئے کیونکہ ان ہی دنوں انھوں نے ایوانِ نمائندگان میں ری پبلکن قیادت کے سلسلے میں مارٹن کو شکست دے دی تھی۔

اُمیدواروں کی نامزدگی

کنونشن کے تیسرے دن نمائندے اصل کام شروع کرتے ہیں یعنی صدارت اور نائب صدارت کے امیدواروں کی نامزدگی ـــــ اس وقت تک بعض متوقع امیدوار دوسرے اہم امیدواروں کے حق میں دستبردار ہو جاتے ہیں اور صرف چند آدمی میدان میں رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں پارٹیاں ممتاز ترین امیدوار کو نامزد کر دیتی ہیں۔ نامزدگی کا کام اس قدر تیزی سے اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ڈیموکریٹک پارٹی نے دو تہائی اکثریت سے نامزدگی کا قدیم طریقہ منسوخ کر دیا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے جنوبی ریاستوں کی قوت کم ہو گئی اور ایسے امیدوار کے امکانات روشن ہو گئے۔ جیسے بڑے بڑے بین الاقوامی شہروں کی اقلیتوں کی تائید حاصل

ہو۔ اسی دو تہائی اکثریت ہی کی بدولت ۱۸۵۶ء میں جیمس بکانن جیسا کمزور آدمی
سرفہرست آ گیا کیونکہ شمالی اور جنوبی ریاستوں کے نمائندے کسی ممتاز شخصیت کو
نامزد کرنے پر متفق نہیں ہو سکے۔ اس کا ایک سبب یہی تھا کہ غلامی کے مسئلہ
پر دونوں میں سخت اختلاف تھا۔ اسی دو تہائی اکثریت کے معاملے پر ۱۹۲۴ء
میں الفریڈ اسمتھ کے دیہی علاقوں کے حامیوں اور جنوبی ریاستوں کے لوگوں
میں تصادم ہو گیا تھا کیونکہ جنوبی ریاست والے کو کلکس کلان سے منسلک ہو چکے
تھے۔ کچھ عرصے کے بعد پارٹی نے جان ڈبلیو ڈیوس کو نامزد کر دیا جو معمولی سی بات
تھی۔ انتخابی مہم شروع ہونے سے پہلے ہی اس کی پوزیشن بہت کمزور تھی۔ کنونشن
میں ایک سو تین ووٹ پڑنے کے بعد ڈیوس کو نامزدگی حاصل ہو سکی۔ اور اجلاس میں
اس قدر ہنگامے ہوئے کہ بعض اوقات ناقابل برداشت صورتحال پیدا ہو گئی۔
اور اس کے مقابلے میں ری پبلکن کا امیدوار جیت گیا کیونکہ پارٹی منظم تھی اور اپنے
امیدوار پر اعتماد رکھتی تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کو نہ صرف ری پبلکن کے مقابلے میں شکست
ہوئی بلکہ نصف سے زائد ریاستوں میں پروگریسو پارٹی سے بھی پیچھے رہ گئی۔ دو تہائی
اکثریت کا طریقہ ختم ہونے سے کنونشن کے طویل طویل اجلاسوں کا سلسلہ رک گیا اور
تعطل کی کیفیت باقی نہ رہی۔ لیکن اس کی وجہ سے ایک نئی صورتحال پیدا ہو گئی۔
جنوبی ریاستوں کو سخت ناگوار ہوئی اور صدارتی انتخابات میں ڈیموکریٹک
پارٹی کی انفرادی خصوصیت بھی ختم ہو گئی۔

بروکنگ شلے نے کنونشن کے نظام کا جو جائزہ لیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ صدارتی امیدوار کے سلسلہ میں جو بنیادی کانفرنسیں ہوتی ہیں ان کی بدولت اور

اجلاسوں کے ذریعے عوام کی رائے زنی کی وجہ سے متوقع امیدواروں کی تعداد اتنی کم ہو جاتی ہے کہ نامزدگی میں آسانی ہوتی ہے بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ توقع ہے کہ آئندہ چل کر ووٹنگ سے ہی نامزدگی کا فیصلہ ہو جایا کرے گا۔

طریقہ کار

جب امیدواروں کی نامزدگی کا وقت آتا ہے تو کلرک ریاستوں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے پکارتا ہے۔ اس پر پہلی ریاست یعنی الاباما اپنی طرف سے یا تو کوئی امیدوار نامزد کرتی ہے یا نفی میں جواب دیتی ہے اور یا اپنی طرف سے کسی دوسری ریاست کو نامزدگی کی اجازت دیتی ہے۔ رواج یہ ہے کہ ریاستی وفد کسی ایسے امیدوار کو نامزد کرتا ہے جو اسی ریاست کا شہری باشندہ ہو۔ یہ بھی روایت ہے کہ الاباما ریاست کسی دوسری ریاست کو نامزدگی کا حق اسی صورت میں دیتی ہے جب وہ اس ریاست کے امیدوار کو زیادہ با اثر اور ممتاز سمجھتی ہے۔ اگر ان میں کوئی بات نہ ہو تو نفی میں جواب دیتی ہے۔

اگر ریاست الاباما جواب دیتی ہے تو پھر الاسکا کا نمبر آتا ہے اور اس کے سامنے بھی وہی راستے ہوتے ہیں۔ اسی طرح باری باری تمام یعنی پچاس ریاستوں کو اپنے امیدوار یا امیدواروں کی نامزدگی کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

جہاں کسی ریاست نے کوئی امیدوار نامزد کیا۔ یا دوسری ریاست کے حق میں دستبرداری کا اعلان کیا تو وہیں سے انتخابی رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ وفد کا جو نمائندہ امیدوار کی نامزدگی کرتا ہے۔ وہ جلسہ گاہ کے سامنے آتا ہے اور اپنے امیدوار کے حق میں نہایت پرجوش تقریر کرتا ہے۔ وہ امیدوار کی خوبیوں اور صلاحیتوں کی داستان بیان کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے۔

"خواتین وحضرات! میں امریکہ کی آئندہ صدارت کے لئے اس کنونشن کے سامنے مسٹر جان ڈبلیو سمتھ کا نام پیش کرتا ہوں ______!"

اس جملے کو سنتے ہی امیدوار کی حمایت کرنے والے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کنونشن کے ہال میں ناچنا، گانا اور چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ جب یہ تماشہ ختم ہوتا ہے تو پانچ یا اس سے بھی زائد نمائندے اس نامزدگی کی تائید کرتے ہیں۔ ہر بار جب تائید کرنے والے کا جملہ ختم ہوتا ہے تو نعرے بازی اور ہنگامہ آرائی کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

اسی طرح یکے بعد دیگرے ریاستوں کے نمائندے پکارے جاتے ہیں اور امیدواروں کی نامزدگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام امیدواروں کے نام اور ان کے حامی کنونشن کے سامنے آجاتے ہیں۔ امیدوار کا نام ظاہر کرنے کے موقع پر ایک جیسی ہی انداز کی تقریر ہوتی ہے اسی انداز پر ختم ہوتی ہے اور آخر میں ویسے ہی ہنگامہ خیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔

انیسویں صدی میں نامزدگی اور تائید کرنے والوں کی تقریریں بڑی طویل ہوا کرتی تھیں۔ اور اس کے بعد نعرے بازی اور ہنگامہ آرائی بھی بڑے زور شور کے ساتھ ہوتی تھی کیونکہ ہر امیدوار کے حامی کنونشن پر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ان کے امیدوار کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ٹیلیویژن لگنے سے پہلے تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن ٹیلیویژن آنے کے بعد کنونشن کے طور طریق میں تھوڑے سے رد و بدل ضروری ہو گیا۔ اب تقریریں مختلف ہوتی ہیں اور ہنگامے بھی کم ہوتے ہیں۔ تائید کرنے والوں کی تقریر پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

جب تمام امیدواروں کے نام پیش ہو جاتے ہیں تو کلرک ووٹنگ کے لئے پھر وفدوں کو اسی طرح باری باری حروف تہجی کے اعتبار سے بلاتا ہے ۔ جب الاباما کا نام پکارا جاتا ہے تو وفد کا سربراہ اپنی نشست پر کھڑا ہوتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ۔۔۔ " الاباما ریاست اپنے اٹھارہ کے اٹھارہ ووٹ ، امریکہ کے آئندہ صدر جان ڈبلیو اسمتھ کو دیتی ہے " ۔۔۔ یا پھر یہ کہتا ہے کہ میرا وفد دس ووٹ اسمتھ کو ، چھ ووٹ جان کو اور دو ووٹ جیمس کو دیتا ہے ۔۔۔ اگر بالفرض وفد نے ابھی تک اپنے ووٹ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تو وہ سربراہ یہ کہتا ہے کہ الاباما ریاست ابھی ووٹ نہیں ڈال رہی ہے ۔ اس صورت میں تمام دوسری ریاستوں کے نام پکارے جانے کے بعد الاباما کو دوبارہ ووٹ دینے کا موقع دیا جاتا ہے ۔

تمام ریاستوں کی فہرست ختم ہو جانے کے بعد کلرک ووٹوں کا اعلان کرتا ہے ۔ اگر مجموعی ووٹوں کی اکثریت کسی ایک امیدوار کے حق میں ہوتی ہے تو اس کے کامیاب ہونے کا فوراً اعلان کر دیا جاتا ہے یا دوسرے امیدواروں کے حامی وفد بھی اتفاق رائے سے اسی کی حمایت کا اظہار کرتے ہیں لیکن اگر اکثریت کسی امیدوار کو حاصل نہ ہوئی تو کلرک دوبارہ وفدوں کے نام پکارتا ہے اور وہ ایک بار پھر اپنے ووٹوں کا اعلان کرتے ہیں ۔ جب تک کوئی امیدوار اکثریت کا ووٹ حاصل نہ کرلے ، یہی عمل جاری رہتا ہے ۔ سن ۱۹۶۰ء میں ری پبلیکن ، اور ڈیموکریٹک کنونشنوں میں امیدواروں کا انتخاب پہلی ہی رائے شماری میں ہو گیا تھا ۔ سن ۱۹۵۲ء میں ایڈلائی اسٹیونسن کو تیسری رائے شماری میں چنا گیا ۔۔۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی نے جس زمانے میں دو تہائی امیدواروں کی حمایت کی شرط لگا رکھی تھی۔ اس وقت وفدوں کے نام پکارنے کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہتا تھا اور اس کے بعد فیصلہ ہوتا تھا۔

نائب صدر کی نامزدگی

نائب صدارت کے امیدوار کا انتخاب بھی بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے صدارتی امیدوار کا — البتہ اس میں تقریریں ذرا اور مختصر ہوتی ہیں اور ہنگامہ آرائی بھی کم ہوتی ہے۔

عام طور پر نائب صدارت کے امیدوار کے لئے زوردار رسہ کشی نہیں ہوتی اور اب تک تو یہی ہوا ہے کہ صدارتی امیدوار کا عمل دخل اس معاملے میں سب سے زیادہ رہتا ہے۔ اگر وہ کسی خاص امیدوار کی نامزدگی کی درخواست کرے تو بیشتر وفد اس کی یہ خواہش پوری کر دیتے ہیں اور اس صورت میں نامزدگی کا معاملہ بہت جلد طے ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس معاملے میں ہمیشہ صدارتی امیدوار کی بات مان لی جائے ۱۸۳۲ء میں اینڈریو جیکسن کے ساتھ کے نائب صدر کے انتخاب پر بڑا جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا۔ ۱۸۳۶ء میں جب ڈیموکریٹک پارٹی مارٹن وان بورن کے لئے نائب صدر کا انتخاب کر رہی تھی۔ اس موقع پر بھی یہی قصہ ہوا۔ اختلافات اس قدر بڑھے کہ بعض ریاستوں نے آخر میں جیتنے والے امیدوار کنٹکی کے رچرڈ جانسن کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انتخابی ادارے کے انتخاب میں جانسن کو اکثریت کا ووٹ حاصل نہ ہو سکا، اور تاریخ میں پہلی بار نائب صدر کا انتخاب کرنے کے لئے سینیٹ کا اجلاس بلانا پڑا اور جانسن جیت گئے۔

۱۹۴۴ء میں نائب صدارت کے امیدوار کے لئے بڑا جھگڑا ہوا۔ اس سال کے کنونشن میں فرینکلن ڈی روزویلٹ کے ساتھی کے لئے ہنری لے ویلیس کی جگہ سینیٹر ہیری ایس ٹرومین کو نامزد کیا گیا۔ اس معاملے میں رائے شماری کے موقع پر تو زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا لیکن انتخاب سے پہلے زبردست لے دے ہوئی۔

اُمیدوار کون ہوتے ہیں؟

صدارتی امیدوار اس صدی میں دونوں پارٹیوں سے صدارت کے بیشتر امیدوار گورنر ہوتے ہیں۔ البتہ نامزد ہونے والوں میں سے صرف دو کانگریس کے ممبر تھے، ایک سپریم کورٹ سے لیا گیا۔ ایک کابینہ سے اور ایک حکومت کے اعلیٰ انتظامی منصب سے آیا جنرل آئزن ہاور کو ۱۹۵۲ء میں اپنی نامزدگی سے پہلے پارٹی کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور ری پبلیکن ہی کے ایک اور امیدوار وینڈل ولکی وکیل تھے اور ۱۹۴۰ء میں نامزدگی سے پہلے انہیں بھی پارٹی کے معاملات میں امتیازی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ ان دونوں مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کے سیاسی نظام میں کتنی لچک ہے اور ضرورت پڑنے پر صدارتی انتخاب کے لئے پارٹی کے باہر کے لوگوں کو بھی نامزد کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال زیادہ امیدوار گورنر ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ رواج کے مطابق وہ اپنی ریاستوں کے وفدوں کو لے کر کنونشن میں شریک ہوتے رہتے ہیں ۔۔۔ اور نمائندوں پر ان کا کچھ نہ کچھ اثر بھی ضرور رہتا ہے۔ دوسرے گورنروں کو انتظامی تجربہ ہوتا ہے جو صدارت کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے اور آخری بات یہ کہی جاتی ہے

گورنروں کو کانگریس کے ممبروں کے مقابلے میں عوام کی خوشنودی زیادہ حاصل رہتی ہے کیونکہ کانگریس کے ممبروں کی کارگزاریوں کے سبب مختلف مقا(مات) کے لوگ انھیں زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اس قسم کے دلائل ان لوگوں کے ہوتے تھے جو صدارتی کنونشن کی سیاست پر تبصرے کرتے ہیں لیکن اگر آج ہم ان کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ دلائل کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ صدارت کے لیے کن کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کون صدر بن سکتا ہے تو معلوم ہوگا کہ سنہ ۱۹۶۰ء تک ماہرین سیاست نے خیال ظاہر کیا تھا کہ بارہ سے پندرہ قسم کے لوگ ہیں جو صدر نہیں بن سکتے اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو صدر منتخب ہونا تو درکنار نامزدگی کی توقع بھی نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں میں چند یہ بتائے گئے ہیں — عورت — اقلیتی نسلی گروپ کا آدمی — کیتھولک — یہودی — سینیٹر — چھوٹی ریاست کا باشندہ یا سال رواں کا نائب صدر — لیکن سنہ ۱۹۶۰ء کے انتخابات کے بعد اس قسم کے فیصلوں پر نظرثانی کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں دو بڑی پارٹیوں کے امیدواروں میں سے ایک سینیٹر اور ایک نائب صدر تھا۔ ان میں ایک کیتھولک بھی تھا اور چھوٹی نہ سہی لیکن اوسط آبادی کی ریاست سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ وہ ملک کے اقلیتی طبقے کا حامی بھی تھا۔ دونوں امیدواروں میں خوب مقابلہ رہا اور معمولی ریاست کا کیتھولک سینیٹر نائب صدر سے کچھ ہی زیادہ ووٹ پا کر جیت گیا۔

انتخابات کے بعد بہت سے تبصرہ نگاروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نامزدگی

کا ڈھنگ بدل گیا ہے۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اب عوام گورنروں کے مقابلے
میں سینیٹروں کو زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں۔ چونکہ خارجہ پالیسی کی اہمیت بڑھتی جاتی
ہے اور اس کی تشکیل میں سینیٹ کا دخل زیادہ ہوتا ہے اس لئے یہ خیال ظاہر
کیا گیا کہ آئندہ گورنروں کے بجائے سینیٹروں کی نامزدگی کے امکانات زیادہ روشن
ہوگئے ہیں۔ شاید یہ خیال درست ہو لیکن سو برس کی طویل مدت میں صدارت
کے لئے دو سینیٹروں کا انتخاب اس بات کا بیّن ثبوت نہیں ہو سکتا کہ انتخابات کے
ڈھنگ انداز بدل گئے ہیں۔

نائب صدارت کے امیدوار

سالہا سال تک تو یہی قاعدہ رہا کہ نائب صدارت
کے امیدوار پارٹی ٹکٹ میں توازن قائم
کرنے کی بنیاد پر نامزد کئے جاتے تھے یعنی اگر صدارت کا امیدوار کسی مشرقی ریاست
کا ہوتا تھا تو نائب صدارت کا امیدوار مغربی ریاست سے لیا جاتا تھا یا اگر صدارتی امیدوار
پارٹی کے آزاد خیال طبقے کا ہوتا تھا تو نائب صدارت کا امیدوار قدامت پرست گروپ
سے تعلق رکھتا تھا۔ توازن کا یہ نظریہ اس بنیاد پر قائم تھا کہ جب تک صدر کا انتقال ہو جائے
نائب صدر کے سپرد کوئی خاص کام نہیں ہوتا تھا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں صرف اسی
امیدوار کے حامی چاہتے تھے کہ ان کا امیدوار منتخب ہو اور مقررہ میعاد تک کام کرتا رہے
نائب صدر کو اہمیت دینے کا خیال اس زمانے سے پیدا ہوا ہے جب بنجمن فرینکلن
نے دیکھا کہ نائب صدر کے لئے کوئی خاص فرائض نہیں ہیں تو اس نے اسے فضول
قرار دیا تھا۔ اس قوم کی تاریخ میں نائب صدارت کے بارے میں یہ خیال بہت عرصہ تک
درست ثابت ہوا لیکن ۱۹۳۲ء میں جب فرینکلن ڈی روزویلٹ صدر منتخب ہوئے —

تو اس منصب کا دائرہ عمل بدلنے لگا۔ روزویلٹ نے اپنے نائب جیمس گارنر کو کانگریس کے ساتھ روابط قائم رکھنے کا فرض سپرد کر رکھا تھا پھر اپنی صدارت کی تیسری میعاد کے دوران اس نے ہنری ولیس کو دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی برسوں کے دوران بہت سے فرائض سپرد کئے۔ صدر ٹرومین کے لئے ان کے نائب البن برکلے بھی بہت سے معاملوں میں نہایت معاون و مددگار ثابت ہوئے۔

البتہ آئزن ہاور کے دور صدارت میں نائب صدر کو واقعی اہم فرائض سونپے گئے۔ صدر آئزن ہاور، نائب صدر نکسن کو کابینہ کے اجلاسوں میں شریک کرتے تھے۔ صدر کی غیر موجودگی میں وہی اجلاس کی صدارت بھی کرتے تھے۔ دوسری سیاسی اور انتظامی ذمہ داریاں بھی انھیں سونپی گئی تھیں۔ اور صدر نے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لئے انھیں دنیا کے دورے پر روانہ کیا۔ نائب صدر کے دائرہ عمل میں اس وسعت کے بعد امیدواروں کی نامزدگی کے معاملے پر نئے سرے سے جائزہ لینا ضروری ہو گیا۔

صدر آئزن ہاور نے کئی موقع پر کہا کہ نائب صدر کو بیشتر معاملوں میں صدر کا ہم خیال ہونا چاہئے اور اسی صورت میں صدر اپنے پروگرام پر عمل کرنے کے سلسلے میں اسے عملی حصہ لینے کی دعوت دے سکتا ہے اور یہ بات بھی اسی وقت ممکن ہے کہ صدر کے انتقال یا معذور ہو جانے کے بعد بھی قومی پروگرام اصول پر بدستور عمل کرنے کا سلسلہ جاری رہے۔ مسٹر نکسن پوری طرح صدر آئزن ہاور کے ہم خیال ثابت ہوئے اور انھوں نے صدر کی خواہش کے مطابق اپنا فرض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں پارٹیوں نے اس بات پر خاص توجہ دی کہ صدارت اور نائب صدارت کے امیدوار کن کن علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم صدارتی امیدواروں نے نائب صدر کی نامزدگی کے لئے ان ہی لوگوں کی حمایت کی جو اہم مسائل میں ان کے ہم خیال تھے۔ ری پبلکن امیدوار ہنری کیبٹ لاج اور نکسن کے خیالات یکساں تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے آزاد خیال طبقے نے لنڈن بی جانسن کو نائب صدر نامزد کیا۔ اس وقت خیال تھا کہ دونوں نظریات میں کافی فرق ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ بیرونی مسائل اور ملکی امور ——— دونوں شعبوں میں دونوں کے خیالات ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آئندہ نائب صدارت کے لئے امیدواروں کی نامزدگی اسی طرح ہوگی جیسے پچھلے چند برسوں کے دوران ہوئی ہے آئندہ صدارتی امیدوار قومی کنونشن پر دباؤ ڈال سکے گا کہ نائب صدارت کیلئے وہی آدمی نامزد کیا جائے جو اس کا ہم خیال ہو۔ علاقائی مصلحتوں کو بھی اسی طرح اہمیت دی جائے گی۔ لیکن یہ فیصلہ کن نہ ہوگی۔ غالباً سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ ایسے صدارتی امیدوار کے خیالات و نظریات کا حامی ہونا چاہئے۔ اگر یہ نئی تبدیلی روایت کی شکل اختیار کر گئی تو اس کا امریکی سیاست پر ایک ایسا اثر پڑے گا کہ حکومت کے کاموں میں نائب صدر کا عمل دخل بڑھ جائیگا اس کے علاوہ وہ عوام کی توجہ کا مرکز بھی بن جائیگا اس سے پہلے نائب صدر کی یہ حیثیت کبھی نہیں رہی۔ اب ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ظاہر ہوگا کہ نائب صدر اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد گمنامی کی زندگی بسر نہیں کریگا۔ سالہاسال تک یہی ہوتا رہا لیکن سنہ ۱۹۶۰ء میں جب نکسن کو ری پبلکن پارٹی نے صدارتی امیدوار نامزد کیا تو نائب صدر کی حیثیت اجاگر ہو گئی۔

صدارتی مہم

قومی کنونشن سے پہلے عام طور پر متعلقہ امیدوار صدارتی انتخابات کی بنیادی کانفرنسوں میں شریک ہو چکے ہوتے ہیں اور دوسری نشستوں کے لئے ریاستی تنظیم کے لیڈروں کی حمایت انھیں پہلے سے حاصل رہتی ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء کے انتخابات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امیدوار کو عام طور پر کن کن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے ری پبلیکن کنونشن میں نائب صدر رچرڈ۔ ایم نکسن کی محض برائے نام مخالفت ہوئی تھی۔ ان کا نام کئی بنیادی کانفرنسوں میں پیش کیا گیا تھا لیکن کوئی طاقتور حریف سامنے نہیں آیا۔ نیویارک کے مشہور و معروف گورنر نلسن راک فیلر کو اپنی ریاست کے بیشتر نمایندوں کی حمایت حاصل تھی۔ اور ری پبلیکن پارٹی کے آزاد خیال طبقے کے کچھ لوگ جذباتی طور پر ان کے حامی تھے۔ کنونشن میں انھیں تقریباً ایک سو بیس ووٹ ملنے کا یقین تھا۔ پارٹی کے قدامت پسند گروپ میں سینیٹر بیری گولڈواٹر تھے اور انھیں تقریباً ستر ووٹوں کی امید تھی۔ اگر دونوں امیدواروں کو توقع کے مطابق پورے ووٹ مل جاتے تو دونوں کے ووٹوں کی مجموعی تعداد اتنی نہ ہوتی کہ کنونشن میں نکسن کی نامزدگی کو روکا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی توقع رکھ سکتے تھے کہ پارٹی کے منشور میں بعض رد و بدل اپنی مرضی کے مطابق کرا لیں اور پھر دستبردار ہو جائیں۔ راک فیلر نے انتخابی منشور کے بارے میں نائب صدر سے گفتگو کی اور مسودے میں بعض تبدیلیاں کر لے کے لئے ان سے سمجھوتہ کر لیا اور کنونشن شروع ہونے سے ایک

دن پہلے انتخاب سے دستبردار ہو گئے۔

سینیٹر گولڈ واٹر نے بھی کئی موقعوں پر نکسن اور ان کے خاص حامیوں سے ملاقات کی اور کنونشن شروع ہونے سے پہلے تک گفتگو ہوتی رہی۔ معلوم نہیں انھیں مطلوبہ مراعات نہیں مل سکیں یا کوئی اور وجہ ہوئی۔ بہر حال انھوں نے کنونشن میں اپنا نام پیش کرا دیا۔ گولڈ واٹر کو بہت ہی کم ووٹ ملے اور نکسن پہلی ہی رائے شماری میں نامزد کر دیئے گئے۔

ڈیموکریٹ سنہ ۱۹۶۰ء کے کنونشن سے پہلے

ڈیموکریٹک پارٹی کے حالات ری پبلیکن سے بالکل مختلف تھے۔ ڈیموکریٹک کنونشن سے ایک سال پہلے کسی بھی امیدوار کو دوسرے پر ترجیح یا برتری حاصل نہ تھی کم سے کم پانچ آدمی کنونشن میں نامزدگی کے مستحق تھے سینیٹر اسٹوارٹ سائمنگٹن، ہربرٹ ایچ ہمفری، لنڈن بی جانسن، جان ایف کینیڈی اور سابق امیدوار ایڈلائی ای اسٹیونسن ان سب کو کم از کم ایک بار نامزدگی کا موقع دیا گیا۔ سینیٹر جانسن اور سائمنگٹن نے بنیادی کانفرنسوں میں شرکت نہیں کی تھی سینیٹر ہمفری اور سینیٹر کینیڈی کا خیال یہ تھا کہ نامزدگی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ بنیادی کانفرنسوں میں کامیابی حاصل کی جائے۔ ایڈلائی اسٹیونسن نے کبھی اپنا نام باقاعدہ پیش کرنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مختلف حریفوں میں رسہ کشی ہو گی اور کوئی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ آخر کار پارٹی اپنا اتحاد اور تنظیم برقرار رکھنے کے لئے انھیں کو نامزد کرنے پر رضامند ہو جائے گی۔ سینیٹر سائمنگٹن اور جانسن نے ان ہی ریاستوں تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھیں جہاں بنیادی کانفرنسوں کا رواج نہیں تھا۔ انھوں نے ریاستی لیڈروں کی حمایت حاصل کی۔ وہ صدارتی کانفرنسوں میں سینیٹر ہمفری۔

یا کینیڈی سے ٹکر لینا نہیں چاہتے تھے۔

آخری دو سینیٹروں نے جو اپنے علاقوں سے باہر کی ریاستوں میں کسی خاص تنظیم کے بغیر کام کر رہے تھے یہ محسوس کیا کہ نامزدگی حاصل کرنے کے لئے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ انھیں عام مقبولیت حاصل ہے۔ چنانچہ انھوں نے کئی بنیادی انتخابات میں حصہ لیا۔ سینیٹر کینیڈی اپنی ریاست میسا چوسٹس کے قریبی علاقے میں کھڑے ہوتے جہاں وہ خاصے مشہور تھے۔ سینیٹر ہمفری نے مانٹ سوٹا اور ساؤتھ ڈکوٹا کے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان ریاستوں میں دونوں میں کوئی خاص مخالفت نہیں ہوئی۔

ظاہر ہے کہ ان چھوٹے موٹے انتخابات میں جیتنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا۔ دونوں یہ بات جانتے تھے کہ اگر کنونشن کے نمایندوں کو اپنی صلاحیت اور اہلیت کا یقین دلانا ہے تو انھیں کسی مقابلے کی ریاست میں ایک دوسرے سے ٹکرانا ہوگا۔ چنانچہ وسکونسن میں پہلا تصادم ہوا۔ اس علاقے میں دونوں کو کچھ فائدے نظر آ رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ یہ علاقہ مانٹ سوٹا کے قریب تھا جہاں ہمفری نے مہم چلا رکھی تھی۔ سینیٹر کینیڈی کو بجا طور پر توقع تھی کہ ریاست کے مشرقی علاقوں کے کیتھولک فرقے کے ووٹر ان کی حمایت کریں گے۔

دونوں امیدواروں نے بڑی زور دار مہم چلائی اور پوری ریاست کا دورہ کیا بہت سے لوگوں سے ملاقات اور بات چیت کی۔ بنیادی انتخابات میں کینیڈی کے حصہ میں ۲۰ ½ اور ہمفری کے حصہ میں ۱۰ ½ نمایندے آئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں میں کوئی بھی ڈیموکریٹک کنونشن کو یہ یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ وہ

عام انتخابات میں جیت سکیں گے۔

دوسرا مقابلے کا علاقہ ویسٹ ورجینیا تھا۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں کینیڈی کے تحقیقاتی عملے نے یہ پتہ لگایا تھا کہ وہاں ہمفری اور ان کی حمایت کا تناسب یہ تھا کہ ستر آدمی کینیڈی کے حامی تھے تو تیس ہمفری کے — لہٰذا کینیڈی کے لئے یہ مقابلے کی بہترین جگہ تھی۔ ویسٹ ورجینیا کی اکثریت پروٹسٹنٹ ہے اس لئے جیتنے کی صورت میں کینیڈی یہ کہہ سکتے تھے کہ کیتھولک امیدوار کی کامیابی کا امکان ہے اور مذہبی امتیاز ان کی کامیابی کی راہ میں حائل نہیں ہے — ویسٹ ورجینیا میں پارٹی کی تنظیم بھی لیڈروں کے ہاتھ میں تھی۔ کینیڈی کو اس قسم کی سیاست سے اچھی طرح واقفیت تھی جب کہ ہمفری اس معاملے میں طفل مکتب تھے تین ہفتوں کی مہم کے بعد کینیڈی بھاری اکثریت سے جیت گئے ہمفری کو سینیٹر جانسن اور سائمنگٹن کے حامیوں کی تائید بھی حاصل تھی کیونکہ وہ بنیادی انتخابات ہی میں کینیڈی کو شکست دے کر آگے قدم بڑھانے سے روکنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود ہمفری ہار گئے۔

اس شکست کے بعد ہمفری نے پھر مقابلہ نہیں کیا سینیٹر کینیڈی نے پروٹسٹنٹ علاقے میں کامیابی حاصل کر کے اپنا لوہا منوا لیا۔ چنانچہ بہت سی تنظیمیں جو نوجوان سینیٹر کی حمایت کرنے میں تامل کر رہی تھیں اب ان کی حامی بن گئیں جولائی میں لاس اینجلز میں جب کنونشن ہوا تو جانسن اور اسٹیونسن کی قوت کے باوجود لوگوں کو یقین تھا کہ کینیڈی ہی نامزد ہوں گے اور وہ واقعی پہلی ہی رائے شماری میں نامزد کر دیئے گئے۔

کنونشن سے پہلے جو تگ و دو کی جاتی ہے اس سے نامزدگی کے طریقہ کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب کسی پارٹی کا صدر برسر اقتدار ہوتا ہے اور وہ دوبارہ انتخاب لڑنا چاہتا ہے تو اسے کامیابی کا تقریباً یقین رہتا ہے بلکہ دو میعادیں پوری کرنے کے بعد بھی اس کی کامیابی کے امکانات روشن رہتے ہیں کیونکہ اس عرصہ میں اس کی شہرت اور مقبولیت خاصی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس مخالف پارٹی کے پاس کوئی ایک ایسا اہم امیدوار نہیں ہوتا جو سب سے ممتاز ہو۔ کنونشن شروع ہونے سے تین ماہ پہلے چار یا پانچ امیدوار ایسے نظر آتے ہیں۔ جنہیں نامزدگی حاصل ہونے کی کافی امید ہوتی ہے۔

کنونشن کے بعد انتخابی سرگرمیاں قومی کنونشن کے بعد عام طور پر پارٹی کے تمام گروپ نامزد امیدوار کے حامی بن جاتے ہیں۔ البتہ ڈیموکریٹک پارٹی کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ صدارت کا ڈیموکریٹک امیدوار عموماً شمالی علاقے کا ہوتا ہے۔ اس لئے جنوب کے کچھ لیڈر نسلی امتیاز کے سوال پر اس کی تائید کرنے میں تکلف محسوس کرتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے انتخابات میں بھی یہی ہوا۔ مسی سی پی، الاباما اور ورجینیا کے کچھ پارٹی لیڈروں نے علانیہ یا خفیہ طور پر ڈیموکریٹک امیدوار کی مخالفت کی کیونکہ وہ نسلی امتیاز کے مسئلے پر اختلاف رائے رکھتے تھے۔ ورجینیا میں ڈیموکریٹک لیڈروں نے دونوں پارٹیوں میں سے کسی کے بھی امیدوار کی تائید کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ البتہ ممکن ہے ورجینیا کے لیڈروں نے ری پبلکن کی خفیہ طور پر حمایت کی ہو۔

سن ۱۹۶۰ء کے انتخابات اسی انداز پر ہوئے تھے جیسے گزشتہ چوتھائی صدی سے ہوتے آئے ہیں۔ البتہ اس میں اتنا اضافہ اور ہو گیا کہ ٹیلیویژن پر مباحثے اور مذاکرے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور صرف ایک رات سات کروڑ پچاس لاکھ آدمیوں نے ٹیلی ویژن پر انتخابی مہم کا منظر دیکھا۔ ہم اس باب کے آخر میں اسی بات کا جائزہ لیں گے کہ ٹیلی ویژن کے ایجاد سے انتخابی مہم پر کتنا اثر پڑا ہے۔

نائب صدر نکسن اور سینیٹر کینیڈی نے نامزد ہونے کے بعد رسم کے مطابق اپنے حامیوں سے وعدہ کیا کہ وہ انتخابی مہم بڑے پیمانے پر چلائیں گے۔ نکسن نے تو یہاں تک کہا کہ وہ ہر ریاست کی یونین میں جا کر تقریریں کریں گے۔ نامزدگی کے دو ماہ بعد ان کے پیر میں چوٹ آ گئی اور وہ دو ہفتے اسپتال میں رہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ سینیٹر کینیڈی نے بھی خوب دورے کئے۔ البتہ انھوں نے جنوبی ریاستوں میں نسبتاً کم وقت گزارا۔ کیونکہ ان کے نائب صدارتی امیدوار لنڈن بی جانسن نے وہاں پروپیگنڈہ کی مہم پہلے ہی سے چلا رکھی تھی۔ دونوں صدارتی امیدواروں نے ملک بھر کا دورہ کیا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ زیادہ وقت بڑی ریاستوں میں گزارا۔ چونکہ کسی ریاست میں سب سے زیادہ ووٹ پانے والوں کو عام تائید حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے زیادہ آبادی کی ریاستوں کی اہمیت بہر حال زیادہ ہوتی ہے۔ دونوں پارٹیاں یہ بات جانتی ہیں کہ نیویارک، پنسلوینیا، نیوجرسی، انڈیانا، اوہیو، مشی گن، مسوری اور کیلیفورنیا کے چند ووٹ بھی انتخابی کالج میں فیصلہ کن ثابت ہو سکتے ہیں کم آبادی کی ریاستوں کی حمایت

حاصل کرنا اچھی بات ہے لیکن تین چار بڑی ریاستوں کی حمایت فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اسی خیال سے کینیڈی نے اپنے دورے کا پچاسی فی صد وقت ان بڑی ریاستوں میں صرف کیا۔ نکسن کو یوں تو زرعی علاقوں کی حمایت پر بھروسہ تھا تاہم انھوں نے بھی کافی وقت بڑی ریاستوں کے دورے میں گزارا۔

دونوں صدارتی امیدواروں نے بڑی ریاستوں کے دورے میں جلسے کئے تقریریں کیں اور مقامی لیڈروں سے گفت و شنید کرتے رہے۔ نیویارک میں کینیڈی کو فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ دوسری ریاستوں میں دونوں کا تناسب یہ رہا کہ اگر نکسن کو تین ووٹ ملے تو کینیڈی کو پانچ ملے۔

انتخابی مہم کے نعرے

ڈیموکریٹک اور ری پبلیکن پارٹیوں کی صدارتی مہم کے دعووں اور نعروں کا پہلے ہی سے علم ہوتا ہے۔ مخالف پارٹی یقیناً برسر اقتدار جماعت پر یہ الزام لگاتی ہے کہ وہ بیرونی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ڈیموکریٹ جنھیں دو تہائی مزدوروں کی حمایت حاصل ہے یہ اعلان کریں گے کہ ری پبلیکن والے غریبوں کی مدد کرنے اور ان کا معیار زندگی بہتر بنانے پر توجہ نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ وہ بعض ایسی اقتصادی حالات کا پروگرام پیش کریں گے جو فلاح و بہبود کے موجودہ قوانین کے دائرے سے خارج ہوگا۔ وہ یہ وعدہ بھی کریں گے کہ کاشتکاری کے تمام مسائل بہتر طور پر حل کئے جائیں گے سنہ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ ری پبلیکن حکومت کی ناکامیوں کی وجہ سے بیرونی ملکوں میں امریکہ کا وقار ختم ہوگیا ہے۔

اس کے برعکس، ری پبلیکن پارٹی کے لوگ اصلاحات کی حمایت تو کریں گے

لیکن یہ کہیں گے کہ قومی بجٹ کو متوازن رکھنا ضروری ہے۔ وہ کسانوں کے مسائل کو اور زیادہ آسانی کے ساتھ حل کر دینے کا وعدہ کریں گے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے فخر کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ آئزن ہاور کے زمانے میں ساری دنیا میں امن وامان قائم رہا باوجودیکہ کمیونسٹوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت بھی نہیں کی گئی۔

روایت کے مطابق دونوں پارٹیاں یہ وعدہ کرتی ہیں کہ وہ سیاہ نسل کے لوگوں کو اور زیادہ شہری حقوق دلائیں گی۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں امیدواروں نے اعلان کیا تھا کہ وہ جنوب میں انتخابی مساوات قائم کرنے کے لئے مرکزی حکومت کے اختیارات سے کام لیں گے اور اسکولوں۔ مکانوں۔ کارخانوں اور دوسرے اداروں میں نسلی امتیاز ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

سنہ ۱۹۶۰ء کی انتخابی مہم میں ایک اور نئی چیز جو شامل ہوئی وہ مذہب ہے۔ اس سے پہلے امریکی تاریخ میں صرف ایک بار کیتھولک فرقہ کا آدمی صدارتی امیدوار نامزد ہوا تھا یعنی الفرڈ اسمتھ سنہ ۱۹۲۸ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار تھے۔ اور ہربرٹ ہوور نے انھیں بری طرح شکست دیدی تھی۔ اس وقت عام طور پر یہی سمجھا گیا تھا کہ کیتھولک فرقہ کے مخالفوں کی وجہ سے انھیں شکست ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں جو حقائق سامنے آئے ان کے پیش نظر یہ خیال بدلنا پڑا۔

بہرحال سنہ ۱۹۲۸ء میں مذہب کا سوال کچھ کتنا ہی اہم رہا ہو۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں اس کی اہمیت بہت گھٹ گئی اور یہ بات انتخابات سے پہلے ہی ظاہر ہو چکی تھی انتخابی مہم کے دوران نائب صدر نکسن نے اعلان کیا کہ کسی خاص مذہبی فرقہ سے وابستگی کی بنا پر کسی شخص کو کسی عہدے سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس بیان کا

مطلب یہ تھا کہ وہ اس مسئلے پر مزید بحث و تکرار نہیں کرنا چاہتے ۔

سینیٹر کینیڈی نے اس مسئلہ کا صرف ایک بار ذکر کیا ۔

ریاست ٹیکساس میں پروٹسٹنٹ فرقے کے ممتاز لیڈروں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کسی کو محض مذہبی تعلق کی بنا پر ووٹ نہیں دینا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ مذہب پر قائم رہنا انسان کا پیدائشی حق ہے اور اس بنا پر کسی کو صدارت کے عہدے سے محروم رکھنا جائز نہیں ۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ سرکاری پالیسی کے معاملے میں وہ کلیسا کے دائرۂ اثر سے آزاد ہیں ۔ بعد میں ان کے اس جلسے کی تقریر کی فلم بہت سے شمالی شہروں میں ٹیلی وژن پر بھی دکھائی گئی ۔

مذہبی سوال کے بارے میں یہ دونوں صدارتی امیدوار خاصے محتاط تھے لیکن ان کے بعض حامیوں نے احتیاط نہیں برتی ۔ ملک کے بہت سے علاقوں سے یہ خبریں موصول ہوئی تھیں کہ کینیڈی کے حق میں کیتھولک فرقے کی حمایت کرنے کے لئے مذہبی فرقہ بندی کا سہارا لیا گیا اور نکسن کے حامیوں نے کیتھولک فرقے کی حمایت کرکے پروٹسٹنٹ طبقہ کی مکمل حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ رائے شماری میں مذہب کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے ۔ ممکن ہے سینیٹر کینیڈی کی کامیابی کے بعد آئندہ انتخابی مہم میں مذہب کا سوال نہ اٹھایا جاسکے ۔

ٹیلی وژن اور انتخابی مہم

یوں تو انتخابی مہم میں ٹیلی وژن کا استعمال ۱۹۵۲ء ہی میں شروع ہو گیا تھا ۔ لیکن سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد اس کی اہمیت نمایاں طور پر بڑھ گئی۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں انتخابی مہم کے آخری دنوں میں دونوں امیدواروں نے چار مباحثوں میں حصہ لیا اور کہا جاسکتا ہے

کہ یہ بڑے فیصلہ کن ثابت ہوتے۔

صحیح معنوں میں تو انھیں مباحثے کہنا ہی درست نہیں — ہوتا یہ تھا کہ اخبار نویس اور مبصّرین دونوں امیدواروں سے سوالات پوچھتے تھے اور دونوں ہر سوال کا الگ الگ جواب دیتے تھے۔ یہ مذاکرے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے تمام اسٹیشنوں سے نشر کیے گئے تھے۔

پہلے مباحثے میں نکسن کا رنگ نہیں جم سکا اور سینیٹر کینیڈی کا پلّہ بھاری رہا۔ اس پورے مذاکرے کے دوران کینیڈی نے خوب بڑھ بڑھ کر حملے کیے اور نکسن اعتدال پسندی کی روش پہ قائم رہے۔ مبصّرین کا خیال تھا کہ یہ مباحثہ کینیڈی نے جیت لیا ہے اور واقعی اس کے بعد کینیڈی کا وقار بڑھ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ایسے شخص کے مقابلے میں جو خطابت کا ماہر سمجھا جاتا ہے کینیڈی نے اپنی بات اونچی رکھی۔

آیندہ مذاکرے میں کینیڈی کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی اور نکسن کو بھی کھویا ہوا وقار بحال کرنے میں زیادہ مدد نہیں ملی۔ یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے کہ یہ مباحثے کامیابی یا ناکامی پر کس حد تک اثر انداز ہوتے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نکسن کو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا اور کینیڈی کو اس سے خاصی تقویت حاصل ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ صدارتی انتخابات میں ٹیلیوژن کے یہ مباحثے اور مذاکرے بہت عام ہو جائیں گے۔

انتخابات

امریکہ کی مختلف ریاستوں میں مختلف اوقات میں ووٹ ڈالے جاتے ہیں۔ ۱۸۴۵ء سے یہ قاعدہ ہے کہ ہر ریاست میں نومبر کے پہلے پیر کے بعد آنے والے

منگل کو انتخابات ہوتے ہیں۔ لیکن ووٹنگ کے وقت کا انحصار ریاست کے قانون پر ہوتا ہے۔

عام طور پر مشرقی علاقوں سے انتخابات کی خبریں پہلے آتی ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہاں رائے شماری کے لئے مشینوں کا استعمال ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ جغرافیائی محل وقوع کے سبب ان کے یہاں کا وقت اور علاقوں سے کچھ آگے ہے۔

پرانی روایت یہ ہے کہ شہری علاقوں میں ڈیموکریٹک کو زیادہ کامیابی ہوتی ہے اور دیہی علاقوں میں ری پبلیکن کا پلہ بھاری رہتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ شہری علاقوں سے اگر ڈیموکریٹک پارٹی کی کامیابی کی خبریں پہلے آئیں تو وہ آخر میں بھی غالب رہیں گے۔ ۱۹۴۸ء میں یہ ہوا تھا کہ صدر ہیری ٹرومین کو دیہی علاقوں کی خبریں آنے تک برابر کامیابی کی اطلاعات ملتی رہیں لیکن کبھی کبھی پہلی کامیابی آخر تک قائم رہتی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں دیہی علاقوں کے پچاس فیصدی سے زائد ووٹروں نے ووٹنگ میں حصہ ہی نہیں لیا ظاہر ہے ایسی صورت میں شہری علاقوں کی کامیابی فیصلہ کن بن جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں شمال مشرق کی ریاستوں سے سینیٹر کینیڈی کی کامیابی کی خبریں پہلے آئیں۔ نیو انگلینڈ کی بعض ریاستوں اور نیو یارک اور پنسلوینیا میں تو انہیں اتنے زیادہ ووٹ ملے کہ سینیٹر نکسن نے ایک رات پہلے ہی یہ پیشگوئی کر دی کہ کینیڈی جیت جائیں گے۔ بعد کی اطلاعات سے بھی اس خیال کو تقویت پہونچی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں میں جو بھی کامیاب ہوگا وہ بہت ہی کم ووٹوں کے فرق سے کامیابی حاصل کرے گا۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے انتخابات میں صورت حال اس قدر غیر یقینی تھی کہ نائب صدر نکسن کو انتخابات کے دوسرے روز تک اپنی ناکامی کا یقین نہیں آیا اور انھوں نے منتخب صدر کینیڈی کو مبارکباد کا تار نہیں بھیجا۔ اس وقت تک بعض ریاستوں کے نتائج آنے باقی تھے۔

باقاعدہ ووٹنگ کے کئی دن بعد، کیلفورنیا کے انتخابات میں نکسن کو کامیاب قرار دیا گیا۔ ہوائی کے بارے میں پہلے کہا گیا کہ اس نے کینیڈی کو ووٹ دیا ہے، پھر نکسن کے حق میں بتایا گیا اور جب سرکاری طور پر نتائج کا اعلان ہوا تو پھر کینیڈی کے حق میں نتیجہ نکلا۔

ایلینس میں کل ۴۷۰۰۰۰۰ ووٹ پڑے تھے اور وہاں کینیڈی صرف ۸۸۵۸ ووٹوں کی اکثریت سے جیتے تھے۔

نیوجرسی اور مسوری نے بھی اس سے کچھ ہی زیادہ ووٹوں سے کینیڈی کی حمایت کی۔ مجموعی طور پر کینیڈی کو ۳۴۲۲۷۰۹۶، اور نکسن کو ۳۴۱۰۸۴۱۹ ووٹ ملے تھے، اور دونوں پارٹیوں کی کل تعداد یعنی ۶۸۳۳۵۳۱۵ ووٹوں میں سے کینیڈی کو ۱۱۸۸۷۷ ووٹوں کی اکثریت سے کامیابی ہوئی تھی۔ انھیں کثرت سے ووٹ اس لئے بھی نہ مل سکے کہ کئی ریاستوں میں تیسری پارٹی کو بھی کچھ ووٹ چلے گئے تھے۔ عام رواج کے مطابق دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے پر الزامات بھی عائد کئے کہ انتخابات میں بدعنوانی اور بے قاعدگی برتی گئی ہے لیکن جب ووٹوں کی دوبارہ گنتی ہوئی اور الزامات کی تحقیقات کرائی گئی تو الزامات غلط ثابت ہوئے۔ بہرحال دونوں صدارتی امیدواروں میں سے کسی نے بھی کسی،

ریاست میں انتخابات کے نتائج پر پرسرِعام اعتراض نہیں کیا۔

انتخابی ووٹ

امریکی طریقۂ انتخاب میں صدارتی اُمیدوار کی کامیابی کا فیصلہ عوامی ووٹوں کی اکثریت سے نہیں ہوتا۔ دستور کے تحت، ریاستوں میں صدر کا انتخاب، صدارتی ووٹر کرتے ہیں۔ اور ہر ریاست کو اتنے ووٹر بھیجنے کا حق ہے۔ جتنے ریاستی نمائندے ایوانِ نمائندگان اور سینیٹ میں ہوں۔ اس نظام کے تحت سنہ ۱۹۶۰ء میں نیویارک کو ۴۵ - کیلیفورنیا کو ۳۲ - پنسلوینیا کو ۳۲، اور الینیس کو ۲۵، انتخابی ووٹ حاصل تھے ٹیکساس اور مشی گن کو بیس یا کچھ زیادہ ووٹ ملے تھے۔ آبادی کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ ہر ریاست میں انتخابی ووٹروں کی تعداد بدلتی رہتی ہے۔ کیونکہ کانگریس میں ممبروں کی تعداد کا انحصار آبادی ہی پر ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے بعد کانگریس اور انتخابی ادارے میں بعض ریاستوں کی اہمیت میں نمایاں فرق ہو گیا۔ اس مردم شماری کی بنیاد پر نیویارک، میساچوسٹس، پنسلوینیا اور الینیس اور بعض دوسری ریاستیں ایوانِ نمائندگان میں ایک یا دو نشستوں سے محروم کر دی گئیں۔ کیونکہ ان کی آبادی کچھ گھٹ گئی تھی۔ فلوریڈا، اور کیلیفورنیا کو سات سات ووٹ زیادہ حاصل ہو گئے۔ ٹیکساس و کئی دوسری ریاستوں کو بھی فائدہ ہوا لیکن زیادہ نہیں۔

امریکی طریقۂ انتخاب کے تحت یہ ممکن ہے کہ صدارتی امیدوار عوامی ووٹوں

کی اکثریت کے بغیر ہی جیت جائے۔ ہر ریاست کے تمام انتخابی ووٹ اس امیدوار کو مل جاتے ہیں جسے ریاست میں سب سے زیادہ عوامی ووٹ حاصل ہوتے ہیں۔ امیدوار اکثریت سے جیتے یا چند ووٹوں سے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اگر کوئی امیدوار چند ریاستوں میں بھاری اکثریت سے جیت جاتا ہے اور باقی ریاستوں میں کچھ ووٹوں سے ہار جاتا ہے تو عام لوگوں کے زیادہ ووٹ تو اسی کو ملتے ہیں لیکن قاعدے کے تحت اسے انتخابی ووٹ کم حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنے حریف سے شکست کھا جاتا ہے۔

امریکی تاریخ میں دو بار ایسا ہو چکا ہے کہ فاتح امیدوار کو ہارنے والے کے مقابلے میں عوامی ووٹ کم ملے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں سیموئل جے ٹلڈن، اپنے حریف رتھر فورڈ، ہائز کے مقابلے میں صرف ایک انتخابی ووٹ سے ہار گئے تھے۔ جب انھیں عام ووٹنگ میں ڈھائی لاکھ ووٹ زیادہ ملے تھے۔ اس کے بارہ برس کے بعد، گروور کلیولینڈ جب دوبارہ صدارتی انتخاب میں کھڑے ہوئے تو انھیں صرف ۱۶۸، انتخابی ووٹ ملے۔ جب کہ ان کے حریف بنجمن ہیریسن کو ۲۳۳ ملے تھے۔ لطف یہ ہے کہ عوامی ووٹنگ میں کلیولینڈ کو ۹۵۷۱۳ ووٹ زائد ملے تھے۔ اس کے بعد بھی کتنی سخت مقابلے ہوئے اور دونوں امیدواروں کے انتخابی ووٹوں کے درمیان بہت کم فرق رہ گیا لیکن ایسا نہیں ہوا کہ جیتنے والے امیدوار کے عام ووٹوں کی تعداد کم رہی ہو۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے انتخابات میں بھی اگر کہیں کہیں معمولی فرق ہو جاتا تو ممکن تھا کہ اقلیتی امیدوار کامیاب قرار پاتا۔ بہر کیف جان ایف کینیڈی کو اس انتخاب میں

۳۰۳، اور رچرڈ نکسن کو ۲۱۹، انتخابی ووٹ ملے تھے۔

انتخابی نظام میں مجوزہ اصلاحات

چونکہ امریکی تاریخ میں دو صدر عوامی اکثریت کے بغیر ہی کامیاب ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی اس بات کا امکان پایا جاتا ہے۔ اس لئے بھی سینکڑوں تجویزیں پیش کی گئیں کہ دستور میں ترمیم کر کے انتخابی طریقہ کار بدل دینا چاہئے۔ سچ تو یہ ہے دستور مرتب ہونے کے بعد ہی سے ایسی تجویزیں پیش ہوتی رہی ہیں۔ ۱۸۰۴ء میں ایک تبدیلی یہ کی گئی کہ ووٹر، صدر اور نائب صدر کے لئے الگ الگ ووٹ ڈالیں۔ اس کے سوا دستور میں ترمیم کرنے کی تمام تجویزیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

پچھلے چند برسوں کی روایت یہ ہے کہ اوسطاً ہر سال تین تجویزیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ ہوتی ہے کہ سارا طریقہ کار بدل دیا جائے اور چند پیش بندیوں کے ساتھ براہ راست عام انتخابات کا طریقہ رائج کیا جائے۔ البتہ ایسے آدمی کو منتخب نہ کیا جائے جس کے ووٹ تو مخالفوں سے زیادہ ہوں لیکن مجموعی طور پر اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ ہر ریاست کو انتخابی ووٹ تو لتے ہی رہنے چاہئیں لیکن مختلف امیدواروں کو جتنے عام ووٹ ملے ہوں۔ اس کے تناسب سے امیدوار کو انتخابی ووٹ دینا چاہئے۔ تیسری تجویز یہ ہے کہ ہر ریاست میں دو بڑے ووٹر چنے جائیں اور باقیوں کا انتخاب انتخابی ضلعے اسی طرح کریں جیسے کانگرس کے ممبروں کا کرتے ہیں۔

جہاں تک براہ راست عام انتخابات کا تعلق ہے تو یہ سچ ہے کہ اس

صورت میں تو وہی منتخب ہوگا جسے عوام کی اکثریت کا ووٹ حاصل ہوگا لیکن باقی دو تجویزوں پر عمل کرنے سے یہ بات نہیں پیدا ہو سکتی۔ البتہ عوامی ووٹوں کی بنیاد پر انتخابی ووٹوں کا فیصلہ کرنے سے اتنا ضرور ہوگا کہ اقلیتی امیدوار کے کامیاب ہونے کے امکانات اور کم ہو جائیں گے لیکن تیسری تجویز سے اقلیتی امیدوار کی کامیابی میں کوئی خاص رکاوٹ نہیں پڑ سکتی۔

اصل بات تو یہ ہے کہ انتخابی طریقہ کار میں تبدیلیاں کرانے کا سبب کچھ اور ہی ہے اور مختلف پارٹیوں نے جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ اپنے نقطۂ نظر اور اپنے فائدے کے خیال سے کی ہیں۔

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ شہروں کی کامیابی ہی اصل چیز ہے۔ اس لئے جن پارٹیوں کو شہری علاقوں میں زیادہ حمایت حاصل ہے۔ وہ براہ راست انتخابات پر زور دیتی ہیں۔ دونوں پارٹیوں کے آزاد خیال گروپ خاص طور پر اس کے حامی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے شمالی ریاستوں کا پلّہ بھاری رہے گا۔ کیونکہ وہاں جنوبی ریاستوں میں ووٹر بننے کی شرطیں بہت سخت ہیں۔ لیکن اگر طریقہ کار بدلا تو جنوبی ریاستیں یہ شرطیں نرم کر دیں گی تاکہ ان کے ووٹروں کی تعداد بڑھ جائے اور وہ کمزور نہ پڑیں۔ چنانچہ جنوبی ریاستیں اس قسم کی تبدیلی کی مخالف ہیں۔

لیکن ووٹوں کے تناسب سے "انتخابی ووٹ" دینے کا طریقہ رائج کرنے میں جنوبی ریاستوں کا فائدہ ہے۔ اس سے گنجان آبادی والی ریاستوں کی برتری بھی ختم ہو جائے گی اور ہر ریاست کو رائے دہی کے قوانین اپنی مرضی کے مطابق نافذ کرنے کا اختیار باقی رہے گا۔

تیسری تجویز یعنی ہر ریاست سے ۲ ووٹ بڑے انتخابی ووٹر چننے اور بقیہ تمام ووٹروں کو عام طریقے پر منتخب کرنے کی حمایت قدامت پسندوں نے کی ہے بلکہ یہ تجویز بھی ان لوگوں نے پیش کی ہے۔ اس تجویز کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ ملک میں انتخاب کا وہی طریقہ اختیار کر لیا جائے جو انیسویں صدی میں بعض ریاستوں میں رائج تھا۔ قدامت پسندوں کو اندرونی علاقوں میں ووٹ کی زیادہ توقع رہتی ہے۔ شہری علاقوں میں آزاد خیال ڈیموکریٹ کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے اور وہ چند ووٹوں کے لئے بڑی قربانیاں کرتے ہیں۔ ری پبلیکن امیدوار بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ دیہی علاقوں اور جنوبی ریاستوں سے زیادہ آس لگاتے ہیں۔ ان علاقوں کے لوگ کانگریس کے لئے تو ڈیموکریٹ ممبروں کو ووٹ دیتے ہیں لیکن صدارتی امیدوار کا معاملہ آتا ہے تو پارٹی کا لحاظ نہیں کرتے اور ری پبلیکن امیدوار کو بھی ووٹ دے سکتے ہیں۔

ان تجویزوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے دور رس نتائج نکلیں گے لیکن سیاست داں تو عام طور پر اگلے انتخابات ہی پر نظر رکھتے ہیں اور دس بیس سال آگے کی نہیں سوچتے۔ اس نقطۂ نظر کی وجہ سے صدارتی طریق انتخاب میں فی الحال کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر تجویز کی مخالفت اور موافقت میں بہت سارے گروپ موجود ہیں اور کسی بھی تجویز کا منظور ہونا مشکل ہے۔

البتہ آئندہ چل کر اگر براہ راست انتخابات یا ہر ریاست میں عام ووٹوں کے تناسب سے ووٹروں کے تعین کا فیصلہ ہوا تو اس سے جنوبی ریاستوں کو رائے شماری میں زیادہ حق مل سکے گا اور کسی حد تک مساوات قائم

ہو سکے گی۔ البتہ اس سے شمال میں سکھوں اور دوسرے اقلیتی فرقوں کی قوت اور اہمیت گھٹ جائے گی۔ چنانچہ اقلیتوں نے اس تجویز کی مخالفت کی ہے۔ صدارتی انتخاب میں اس وقت سب سے زیادہ اہمیت بڑے شہروں کو حاصل ہے اس لئے وہاں کے لیڈر یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا طریقہ کار منظور کیا جائے جس سے ان کی اہمیت مشکوک ہو جائے۔

ان تبدیلیوں سے شہروں کے ووٹروں کو دور رس فوائد حاصل ہوں یا نہ ہوں لیکن پارٹی لیڈروں کو بہر حال اپنا اثر و رسوخ نہیں ہوگا جتنا ایسا ہوتا ہے۔ اس وقت تک قومی کنونشن میں لیڈر یہ کہتے ہیں کہ شہری ووٹروں کی مدد کے بغیر وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے انہیں ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ جنوبی ریاستوں کے قدامت پسند نائب کی تجویز اور عام ووٹنگ کی اسکیم کے اس لئے بھی خلاف ہیں کہ ریاستوں میں دونوں پارٹیوں کا مقابلہ اور شدت اختیار کر جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مقابلہ بڑھنے سے ووٹروں کے لئے شرطیں نرم کر دی جائیں گی تاکہ مقامی قانون جن لوگوں کی راہ میں حائل ہے وہ ووٹ دے سکیں اور عام ووٹروں کی تعداد بڑھ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ووٹروں میں آزاد خیال لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ریاستوں میں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تبدیلی کی وجہ سے قوم کے چند گروہوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن سیاسی لیڈروں اور ان کے حامیوں کو وقتی طور پر

جو فائدے ہوتے ہیں وہ شاید حاصل نہ ہوں اسی لئے وہ ان تجویز دلیا
کے خلاف ہیں ۔

اور اگر تبدیلی کی تجویز خود کانگریس میں دو تہائی اکثریت سے
پیش کی جائے تو بھی تین چوتھائی ریاستوں کی مطلوبہ حمایت حاصل نہ
ہوسکے گی ۔ چنانچہ موجودہ طریقہ اچھا ہو یا ناقص لیکن ایک عرصہ تک
یہی رائج رہے گا ، ہاں اگر عام دوٹوں کی بھاری اکثریت کے باوجود
صدارتی امیدوار ہارنے لگیں اور اقلیتی امیدوار انتخابی دوٹوں کے
سہارے جیتنے لگیں تو ایک طرح کی بحرانی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور
اس صورت میں عوام اس مسئلے پر دوبارہ سوچیں گے ۔ اس وقت شاید
کوئی مناسب تبدیلی رونما ہو ۔

انتخابی نتائج کا جائزہ

گزشتہ انتخابات میں جان کنیڈی
دوٹوں کے معمولی فرق سے کامیاب
ہوئے تھے لیکن ایوان نمائندگان کی نشستوں کے انتخاب میں ڈیمو
کریٹک امیدواروں کو نمایاں کامیابی ہوئی تھی ۔ علاوہ ازیں
کانگریس کے دوسو اٹھائیس انتخابی حلقوں میں نائب صدر نکسن کو ۔
اور دوسو چھ میں کنیڈی کو غالب اکثریت حاصل رہی تین حلقوں
نے زیادہ دوٹ ایک تیسرے اُمیدوار کو دئے تھے ۔ اس اعتبار سے
۱۹۶۰ء کا انتخاب اسی ڈھنگ پر تھا جیسا ۱۹۴۸ء سے ہوتا آیا ہے ۔
۱۹۴۸ء میں صدر ٹرومین کو انتخابی ادارے میں معمولی اکثریت حاصل

ہوئی اور بیشتر انتخابی حلقوں میں انھیں کثرت ووٹ ملے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں
انتخابی حلقوں کی اکثریت ری پبلکن کے حق میں تھی اور کانگریس کے
اُمیدواروں کے مقابلے میں جنرل آئزن ہاور کو بہت سے حلقوں میں
بھی فتح حاصل ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں آئزن ہاور کو اور زیادہ نمایاں
کامیابی ہوئی لیکن ایوان نمائندگان کے انتخاب میں ڈیموکریٹک اُمید
واروں کا پلہ بھاری رہا۔

جہاں تک ایوان نمائندگان کے انتخاب کا تعلق ہے ڈیموکریٹک
پارٹی شمالی اور جنوبی دونوں علاقوں میں جیت سکتی ہے اور یہی وجہ
ہے کہ ۱۹۵۲ء کے سوا ۱۹۴۸ء سے ہر انتخاب میں ڈیموکریٹک کو ایوان
نمائندگان میں اکثریت حاصل رہی لیکن ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار
کے معاملے میں جنوبی علاقوں کا رویہ مختلف رہا اور انھوں نے حمایت
نہیں کی۔ جن ووٹروں نے اپنے حلقے میں ایوان کی نشست کے لئے
ڈیموکریٹک امیدواروں کو ووٹ دئے تھے انہیں لوگوں نے صدارت کے
امیدوار کی مخالفت کی۔ ۱۹۴۸ء میں چار ریاستوں نے اپنا صدارتی
ووٹ "اسٹیٹس رائٹس پارٹی" کو دیا تھا۔ ۱۹۵۲ء، ۵۶، ۶۰ء میں چار یا
پانچ ریاستوں نے اپنے صدارتی ووٹ یا تو ری پبلکن پارٹی کے امیدوار
کو دئے تھے یا ورجینیا کے سینیٹر ہیری بائرڈ کو۔ مختصر یہ کہ جنوبی ریاستوں
میں کانگریس کے ڈیموکریٹک امیدواروں کی کامیابی تو یقینی ہوتی ہے
لیکن صدارتی امیدوار ان سے زیادہ توقع وابستہ نہیں رکھ سکتا۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے انتخابات میں دونوں صدارتی امیدوار مقامی انتخاب میں بھی شریک تھے اور انہیں کہیں کم اور کہیں زیادہ ووٹ ملے تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ میں صدارتی مقابلہ بڑی حد تک دو شخصیتوں کا مقابلہ ہوتا ہے اور کسی خاص پارٹی سے وابستگی کا زیادہ لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مثلاً پچھلے انتخابات میں مذہبی امتیاز کا سوال اُٹھایا گیا تھا لیکن مبصرین کی رائے یہ ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسی طرح ٹیلیفون کے مذاکرے تھے جن میں کنیڈی کو یہ ثابت کرنے کا موقع ملا کہ وہ کسی سیاسی مخالف کے مقابلے کے لئے کتنا دم خم رکھتے ہیں۔

صدارتی مہم کے اخراجات

سنہ ۱۹۶۰ء کے صدارتی انتخابات کی ملک گیر مہم میں دونوں بڑی پارٹیوں نے ۰۰۰,۰۰۰,۹ ڈالر خرچ کئے تھے۔ اس رقم میں صرف وہ اخراجات شامل ہیں جو ایک سے زائد ریاستوں میں کام کرنے والی کمیٹیوں کے تھے۔ قومی تنظیم نے ریاست یا لوکل کمیٹیوں کو جو رقمیں دیں وہ اس میں شامل نہیں ہیں۔ دوسرے چھوٹے عہدوں اور نشستوں کے انتخابات کی مہم پر جو رقم صرف ہوئی وہ بھی اس خرچ

میں شمار نہیں کی گئی، اور اگر تمام مصارف کو یکجا کر دیا جائے تو ۱۷۵ ملین ڈالر تک پہونچ جاتی ہے۔

قومی کمیٹیوں نے پچھلے برسوں میں جو رقمیں خرچ کیں ان کا بیشتر حصہ صدارتی امیدواروں کو ٹیلی ویژن پر تقریر کرنے اور بحث کیا حصہ لینے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے پر صرف کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں کمیٹیوں نے اپنی ایک تہائی رقم اسی مد میں خرچ کی تھی۔ ۱۹۶۰ء کے انتخابات میں ٹیلی ویژن کمپنیوں نے صدارتی مہم کی بحثوں کیلئے کنیڈی یا نکسن سے کوئی معاوضہ نہیں لیا اس کے باوجود ٹیلی ویژن کے کے اخراجات اتنے ہی تھے جتنے ۱۹۵۶ء میں۔

مہم کے دوران صدر اور نائب صدر کے منصب کے امیدوار کو بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا ہے عام طور پر وہ خاص جہاز میں سفر کرتے ہیں اور ان کے ساتھ پورا عملہ ہوتا ہے ۱۹۶۰ء میں جان ایف کنیڈی نے تینتالیس ریاستوں میں چوالیس ہزار میل سے زائد فاصلہ طے کیا۔ رچرڈ نکسن نے پچاس ریاستوں کا دورہ کیا اور کل پینسٹھ ہزار میل کا سفر کیا۔

ہر قومی کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر میں کافی عملہ ہوتا ہے، ہزاروں کتابیں اور کتابچے چھپتے ہیں اور ملک بھر میں تقسیم ہوتے ہیں، البتہ عام طور پر اس قسم کے مصارف مقامی کمیٹیاں برداشت کرتی ہیں۔

موجودہ قوانین کے تحت ہر قومی کمیٹی کی آمدنی اور خرچ کی حد

تین لاکھ ڈالر مقرر ہے اس کے علاوہ دو یا دو سے زیادہ ریاستوں میں کام کرنے والی کمیٹیوں کو کوئی شخص پانچ ہزار ڈالر سے زیادہ عطیہ نہیں دے سکتا لیکن جیسا کہ مہم کے اخراجات کے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے ان قوانین سے اخراجات اور عطیات پر عملاً کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی، اس لئے کمیشن نے سفارش کی کہ ان قوانین کو ختم کر دیا جائے۔

قانون میں یہ شرط نہیں ہے کہ ہر امیدوار کی حمایت کے لئے کتنی قومی کمیٹیاں قائم کی جا سکتی ہیں اور نہ یہ بتایا گیا کہ کوئی شخص کتنی کمیٹیوں کو عطیات دے سکتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ کمیٹیاں برابر بڑھتی رہتی ہیں اور لوگوں کے عطیات کی رقم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

۱۹۵۶ء میں ۲۵۹ آدمیوں نے بڑی پارٹیوں کی صدارتی مہم میں کم سے کم پانچ پانچ ہزار ڈالر چندہ دیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے ایک سے زائد کمیٹیوں کو عطیے دیئے۔ یہ بات تو ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ بڑی پارٹیوں میں مستقل چندہ دینے والے ممبر نہیں ہوتے۔ تاہم ۱۹۵۶ء کی مہم میں اسی لاکھ سے زائد آدمیوں نے چندہ دیا۔ ۱۹۵۲ء میں جتنے لوگوں نے چندہ دیا تھا یہ تعداد اس سے تیس لاکھ زائد ہے۔ ابھی ۱۹۶۰ء کے اعداد و شمار نہیں ملے ہیں لیکن خیال ہے کہ چندہ دینے والوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بیشتر لوگوں کے چندے کی رقم بہت قلیل ہوتی ہے۔

امریکہ میں انتخابی مہم کے اخراجات اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ سیاسی پارٹیوں کے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ صدر آئزن ہاور اور صدر کینیڈی، دونوں نے اس مسئلے پر توجہ دی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اخراجات کی تقسیم پورے ملک میں ہو، یہ نہیں کہ صرف گنتی کے دولت مند لوگ ہی تمام مصارف ادا کر دیں۔ یوں تو اس وقت بھی چندہ دینے والے عام لوگوں کی تعداد کافی زیادہ ہے تاہم صدر کے کمیشن نے عوامی چندہ کی تحریک کو اور زیادہ عام کرنے کیلئے سفارشیں پیش کی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ جن لوگوں نے دس ڈالر یا اس سے زائد چندہ دیا ہو ان پر دس ڈالر سالانہ کا ٹیکس عائد کر دینا چاہیئے۔ اسکے علاوہ نہ صرف کمیٹیوں بلکہ امیدواروں کو بھی آمدنی اور خرچ کی تفصیلات زیادہ باقاعدگی سے پیش کرنی چاہئیں۔

صدر کے کمیشن نے اس تجویز کی مخالفت کی کہ حکومت کو انتخابی مہم کا خرچ برداشت کرنا چاہیئے۔ کمیشن نے کہا کہ یہ مصارف نجی طور پر ہونے چاہئیں۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑھتے ہوئے اخراجات سرکاری مدد کے بغیر پورے نہیں ہو سکیں گے۔ بہر حال جب تک دوسرے ذرائع آزمائے نہیں جاتے، اس وقت تک حکومت اخراجات برداشت کرنے کا فیصلہ کن قدم نہیں اٹھائے گی۔

خلاصہ

امریکہ کی سیاسی زندگی میں صدارتی مہم سب سے بڑا اور ہنگامہ خیز

واقعہ ہوتا ہے اور انتخابات کے آخری لمحے تک قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جس سال انتخابات ہوتے ہیں اس کے موسم سرما کے بعد ہی سے نیو ہیمپ شائر میں بنیادی کانفرنس شروع ہوتی ہیں، قوم کی نظریں ان لوگوں پر پڑنے لگتی ہیں جو کنونشن کے لئے نمائندوں کی حمایت کے آرزومند رہتے ہیں۔

قومی کنونشن کے مناظر ٹیلی ویژن پر پیش کئے جاتے ہیں اور انہیں سارے ملک میں لاکھوں کروڑوں آدمی دیکھتے ہیں۔ اور جب صدارتی امیدوار نامزد کر دیئے جاتے ہیں تو مہم اپنے نقطہ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

چند ہفتوں کے اندر صدارتی امیدوار ملک کا دورہ شروع کر دیتے ہیں اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ بڑی پارٹیوں کے بڑے لیڈر ملک کے گوشے گوشے میں تقریریں کرتے ہیں البتہ گنجان آبادی کے علاقوں اور ریاستوں میں زیادہ زور لگاتے ہیں ۱۹۶۰ء میں صدارتی امیدواروں نے ٹیلی ویژن پر مذاکرے کئے تھے اور خیال ہے کہ آئندہ تمام انتخابات میں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

پورے ملک میں لاکھوں رضاکار کام کرتے ہیں اور ووٹروں کو پولنگ اسٹیشن تک لے جانے اور اپنے امیدواروں کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ دونوں صدارتی امیدواروں کی

کامیابی کے امکانات بڑھانے کے لئے لاکھوں ڈالر پانی کی طرح بہا دیئے جاتے ہیں۔

انتخابی مہم کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے، عوام کو امیدواروں کے جانچنے پرکھنے کا کافی وقت ملتا ہے خاص کنونشن میں امیدواروں کی نامزدگی ہوتی ہے اور پھر وہ ملک بھر کا دورہ کرتے ہیں ان تمام باتوں کی وجہ سے امیدوار کی کامیابی میں اس کی شخصیت ہی فیصلہ کن عنصر بن جاتی ہے۔ اور اس کی ذاتی مقبولیت اور قوت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی پارٹی کی حدوں کو پار کر جاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ دوسری نشستوں پر پارٹی کی ناکامی کے باوجود وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ ملک میں بیشتر لوگوں کے نزدیک صدارتی امیدوار نہ صرف اپنی پارٹی کا نمائندہ ہوتا ہے بلکہ وہ قوم کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔

۸

امریکی سیاست
اور
سیاسی ادارے

بیسویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ دنیا بھر میں اب مجلس قانون ساز کے مقابلے میں انتظامیہ کا وقار اور اختیار بڑھتا جا رہا ہے حکومت کو جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان میں امورِ خارجہ کا مسئلہ سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ داخلی مسائل بھی پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ عوام کی سماجی اور اقتصادی بہبود کے لئے حکومت کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ چنانچہ انتظامیہ کے سربراہ اپنے ماہرین کی مدد سے بنیادی پالیسی کا خاکہ مرتب کرتے ہیں اور تفصیلات بھی طے کرتے ہیں مجالس قانون ساز کا کام عام طور پر یہی رہ گیا ہے کہ وہ انتظامیہ کی تجویزوں کی توثیق کرتی رہیں۔

اس تبدیلی کا اثر امریکی اداروں پر بھی پڑا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا دوسرے ملکوں کے اداروں پر — پالیسی کے معاملات میں کانگریس کی بالادستی اب بھی قائم ہے البتہ داخلی امور میں صدر کے اثرات بڑھ گئے ہیں لیکن اس معاملے میں بھی کانگریس کا اختیار مسلم

ہے۔ مثلاً تقریباً ساری کانگریس چین کی مخالف ہے اس لئے چین سے تعلقات کے معاملے میں صدر خود کوئی پیش قدمی نہیں کرسکتا۔ دفاع اور خارجی ضروریات کے لئے صدر جن رقوم کا مطالبہ کرتا ہے وہ عام طور پر منظور ہو جاتی ہیں لیکن منظوری دینے

والی کمیٹیاں تمام مطالبات کی چھان بین کرتی ہیں اور عام طور پر صدر کی مطلوبہ رقوم میں کچھ نہ کچھ تخفیف ضرور کر دیتی ہیں۔

قانون سازی کے بعض معاملوں میں صدر سلسلہ جنبانی ضرور کر سکتا ہے لیکن انتظامیہ پر کانگریس کا کنٹرول کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ کانگریس کی کمیٹیوں کے ممبر طویل تجربے کی بنا پر انتظامی حکام سے زیادہ ماہر ہوتے ہیں البتہ فنی معاملات میں وہ اتنا زیادہ دخل نہیں رکھتے۔ یہ کمیٹیاں انتظامیہ کو من مانی کرنے سے روکتی ہیں۔ اگر قانون کا نفاذ غلط رنگ میں ہو تو ایسی صورت میں اعلیٰ حکام بلکہ صدارتی کابینہ کے ممبروں کو بھی یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ایوان اور سینٹ کے ممبر کسی بھی معاملہ کی چھان بین کر سکتے ہیں۔ اگر کانگریس میں اکثریت مخالف پارٹی کے ممبروں کی ہو تو وقتاً فوقتاً اس قسم کی تحقیقات ہو سکتی ہیں اور صدر کے لئے پریشانی کا سبب بن سکتی ہیں لیکن ایوان میں صدر کی اپنی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو تو بھی اس قسم کا اندیشہ لاحق رہتا ہے کیونکہ دستور کے تحت انتظامیہ اور مقننہ بالکل علیحدہ ہیں اور خود مختاری کا یہ احساس

عام طور پر پارٹی بندی پر غالب رہتا ہے۔

بعض دوسرے ملکوں کے مقابلے میں امریکی کانگریس کو ابھی تک حکومت کے اختیارات میں دوسرے اداروں سے زیادہ عمل دخل حاصل ہے کیونکہ بعض دستوری ترمیموں کی بدولت ایوان کے ممبر انتظامیہ کے دائرہ اثر سے باہر رہتے ہیں۔ ملک میں وفاقی نظام ہے اور انتخابات پر ریاستوں کا کنٹرول ہے جس کی وجہ سے کانگریسی ہوں یا سینیٹ کے ممبر ان کو اپنے علاقوں میں ایسی مضبوط سیاسی حیثیت حاصل رہتی ہے جو صدارتی اثرات سے بالاتر ہوتی ہے۔ شہروں اور صنعتی علاقوں میں پارٹی کی تنظیم کے سبب سیاسی اختیارات کی تقسیم میں کچھ عدم توازن ضرور رہتا ہے لیکن بنیادی اور عام انتخابات میں مقامی پارٹیوں کا اثر و رسوخ بھی بہت کم رہتا ہے اور امیدواروں کے انتخاب میں انھیں فیصلہ کن حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ کانگریس کے ممبروں کے لئے ضروری ہے کہ متعلقہ ریاست یا ضلع کے باشندے ہوں اس لئے ایسے ممبر پارٹی کی ریاستی یا قومی تنظیم کی ہدایات کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی قوت کا سرچشمہ تو وہ اسی علاقے کے عوام ہوتے ہیں۔ اس لئے انتخابات میں حصہ لینے کی خواہش پارٹیوں کے ایما پر اتنی نہیں ہوتی جتنی اپنی ذاتی خواہش پر ــــــ

چونکہ انتظامیہ اور مجلس قانون ساز ایک دوسرے سے الگ اور خود مختار ہیں اور کانگریس کے ممبر اپنے علاقوں میں انفرادی طور

پر ایک حیثیت رکھتے ہیں اس لئے پارٹیوں کی تنظیم بہت زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ اس طرح پوری قوم کے بے شمار آدمیوں کی آواز سنی جا سکتی ہے۔ اگر پارٹی مضبوط اور مرکوز ہو تو ممکن ہے بعض علاقوں کے لوگ نظر انداز کر دیئے جائیں جب کسی پارٹی کو اکثریت کا یقین ہو جائے تو وہ اقلیت کو نظر انداز کر سکتی ہے۔ ابھی تو یہ ہوتا ہے کہ جب علاقائی مفادات کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو کانگریس کی اکثریتی پارٹی صرف اس بنا پر جیت جاتی ہے کہ بعض اقلیتی پارٹی کے کچھ ممبر بھی اس کا ساتھ دے دیتے ہیں تاہم یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ پارٹی کا کوئی اثر و اقتدار ہوتا ہی نہیں۔ بہت ہی کم ری پبلکن ایسے ہوں گے جو ہمیشہ ڈیموکریٹ امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں۔ اسی طرح ڈیموکریٹک پارٹی کے بہت ہی کم لوگ ری پبلکن کے حق میں ووٹ ڈالتے ہیں۔ عام طور پر کانگریس کے ممبروں اور صدر کے انتخابات اور تمام اہم قومی معاملات میں لوگ اپنی ہی پارٹی کے لیڈروں کی حمایت کرتے ہیں۔ کانگریس کے زیادہ تر ممبر پارٹی لیڈروں ہی کو ووٹ دینا پسند کرتے ہیں لیکن بعض اوقات اپنے ضمیر کی آواز یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ایسا نہیں کر پاتے۔

چونکہ امریکی سیاست میں بڑی وسعت اور کشادگی ہے اور کانگریس کے ممبروں اور ان کے حلقوں کے درمیان پارٹی کے بجائے ذاتی رشتہ ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے

مفادات کا زیادہ خیال رکھتے ہیں لیکن قانون سازی کے معاملات
میں وہ محدود علاقوں کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اور کانگریس کے ممبران
کا کام صرف قانون سازی ہی نہیں ہے بلکہ وہ شہریوں اور حکومت
کے درمیان رابطے کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں، چنانچہ ہر سال ہر ممبر کو
مختلف حلقوں کی جانب سے ہزاروں درخواستیں اور اپیلیں موصول
ہوتی ہیں اور یہ ممبر سیاسی وابستگی کا لحاظ کئے بغیر ان پر توجہ دیتے ہیں۔
وہ سمجھتے ہیں کہ منتخب ہونے کے بعد یہ ان کے فرائض میں داخل ہے
اس طرح حکومت اور عوام میں ایک انسانی تعلق قائم رہتا ہے۔ ہر
شہری یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے ممبروں اور سینیٹروں کی معرفت وہ
حکومت سے قریبی رابطہ قائم رکھے بصورت دیگر حکومت اور عوام
کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا اور انسانی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے سیاسی نظام کی وجہ سے بے عمل اور نا
اہل حکومت قائم ہوتی ہے صدر اور کانگریس کے پارٹی لیڈروں کی
جانب سے جو تجاویز پیش کی جاتی ہیں ان پر بہت دیر میں عمل کیا جاتا
ہے بعض اوقات انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ صرف جنگ اور
تجارتی ... کے وقت حکومت تیزی سے حرکت کرتی ہے لیکن ایسے
موقعوں پر کانگریس عارضی طور پر اپنے تمام اختیارات صدر کو سونپ
دیتی ہے اور خود بری الذمہ ہو جاتی ہے، جب بحرانی دور گزر جاتا ہے
تو حکومت کا کام پھر سے پرانے ڈھرے پر چلنے لگتا ہے اور اس سست روی

کا تدارک پارٹی لیڈروں کے بس سے باہر ہوتا ہے ۔

یہ تجزیہ یقیناً درست ہے لیکن پھر تو دوسرے لفظوں میں یہی بات ہوئی کہ عوام کو تقریباً ایک سو پچھتر برس سے یہی رنگ ڈھنگ پسند ہے ۔ امریکہ میں بیشتر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی حکومت اور پارٹیوں کا نظام اس انداز پر قائم رہے کہ اقتدار و اختیار چند ہاتھوں میں مرکوز نہ ہوتے پائے ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر اس نظام کے سبب حکومت کی اہلیت اور کارگزاری پر کچھ برا اثر پڑتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ عوام اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر اتنا نقصان بخوشی برداشت کر لیتے ہیں ۔